قومیت اور بین الاقوامیت

قومیت اور بین الاقومیت

محمد قاسم حسن۔ بی اے۔ بی۔ ٹی

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

۔ اوّل ۱۰۰۰

قیمت عہ

عرض ناشر

مکتبہ جامعہ نے اپنے پنج سالہ پروگرام کے تحت دُنیا کی بعض اہم سیاسی تحریکوں اور مسائل پر تقریباً بارہ مقالے لکھوانا طے کیا تھا۔ یہ مقالہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس وقت چار رسالے بیک وقت شائع کیے جا رہے ہیں یعنی ممالک اسلامیہ کی سیاست، بحر الکاہل کی سیاست، قومیت اور بین الاقوامیت اور نازیت۔ ہمیں امید ہے کہ وہ حضرات جو اُردو میں سیاست پر کچھ پڑھنا چاہتے ہیں انھیں پسند فرمائیں گے۔

ناشر

فہرست مضامین

مضامین

مضامین

باب ۱

قومیت

جماعت پسندی انسان کی جبلّت میں داخل ہے۔ اس لئے تہذیب کے ابتدائی دور ہی سے مشترک اغراض و مصالح کے ماتحت افراد کو اشتراک عمل اور تعاون کی ضرورت پڑی، اور وہ اجتماعی شکل میں متحد ہونے لگے۔ عرصہ تک ساتھ رہنے کی وجہ سے ہر جماعت میں مشترک رسم و رواج پیدا ہوئے۔ مشترک روایات جڑ پکڑنے لگیں۔ مشترک زبان نے رواج پایا۔ مشترک ادب و فن رونما ہوا اور مشترک تاریخ قائم ہونے لگی۔ اس اشتراک کی وجہ سے ہر جماعت کے افراد اپنے آپ کو ایک دوسرے سے مشابہ پانے لگے اور اس مشابہت نے اُن میں ایک ایسا روحانی اور قلبی تعلق پیدا کر دیا کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہوگیا۔ وہ ایک وحدت بن گئے اور ان جماعتوں سے جو رسم و رواج "تاریخ و روایات اور زبان و ادب میں اُن سے مختلف تھیں اپنے آپ کو علیحدہ سمجھنے لگے۔ افراد کی یہ اجتماعی ہیئت "اقوام" کہلائی اور اسی کو آج کل "قومیت" (Nationality) کہا جاتا ہے۔ لارڈ برائس نے اپنی کتاب "بین الاقوامی تعلقات" میں قومیت کی تشریح

مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے :۔

تشریح : "ایک قومیت سے مراد اشخاص کا ایسا مجموعہ ہے جس کو چند مخصوص جذبات نے ملاکر باہم مربوط کر دیا ہو۔ ان میں سے بڑے اور طاقتور جذبے تو دو ہیں: ایک جذبۂ نسل دوسرا جذبۂ دین۔ لیکن مشترک زبان کے استعمال، مشترک ادب سے دلچسپی، زمانۂ ماضی کے مشترک قومی کارناموں اور مشترک مصائب کی یاد، مشترک رسم و رواج، مشترک افکار و خیالات اور مشترک مقاصد اور حوصلوں کو بھی اس احساس جمعیت کے پیدا کرنے میں بہت کچھ دخل ہے۔ کبھی یہ سب رابطے بہ یک وقت موجود ہوتے ہیں اور مجموعہ افراد کو متحد رکھتے ہیں اور کبھی اُن میں سے بعض رابطے موجود نہیں ہوتے لیکن قومیت پھر بھی موجود ہوتی ہے۔"[لہ]

قومیت در اصل انسان کی ایک مخصوص نفسی حالت کا نام ہے، اس کا تصور انسان کی داخلی کیفیات کے ماتحت قائم ہوتا ہے اس لئے اس کا دار و مدار تمام تر انسان کے ذاتی نقطۂ نظر، جذبات، میلانات اور احساسات پر ہے یہی وجہ ہے کہ قومیت کی بالکل صحیح صحیح تعریف کرنا مشکل ہے، مغرب یا مشرق میں شاید ہی کوئی دو ملک ایسے ملیں جہاں لفظ قوم کے ایک ہی معنی سمجھے جاتے ہوں۔ فلسفیوں نے بھی اپنے اپنے رجحانات کے مطابق قومیت

لہ International Relations
مصنفہ Lord J. Bryce صفحہ ۱۱۶

کی تعریف کی ہے اس لئے ان کے اقوال کو بھی معیار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔
البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جب تک کسی جماعت کے افراد میں یہ احساس
موجود نہ ہو کہ وہ ایک جماعت ہیں اور ان میں یہ عزم نہ پایا جاتا ہو کہ وہ ایک
وحدت بن کر رہیں گے اس وقت تک ان میں قومیت پیدا نہیں ہوتی، ساتھ
ساتھ قومیت کی تشکیل کے لئے نسلی، وطنی، لسانی، مذہبی اور معاشرتی
اشتراکات کی مدد بھی درکار ہوتی ہے، یہی اشتراکات افراد میں احساس جمعیت
پیدا کرتے ہیں۔ اور جب یہ احساس پورے طور پر مستحکم ہو جاتا ہے تو فرد اپنی انفرادیت
کو قومی خودی میں جذب کر دیتا ہے اور قومیت وجود میں آجاتی ہے۔ اس کے
بعد قومیت کے ارتقا میں اگر کسی قسم کے حقیقی یا خیالی موانع پیش آتے ہیں تو
ان کے دفعیہ کے لئے افراد میں جو جذبہ رونما ہوتا ہے اُسے نیشنلزم یا قوم
پرستی کہا جاتا ہے۔ یہی قوم پرستی جب غلو کی حد تک پہنچ جاتی ہے تو انسان
میں عصبیت اور تنگ نظری اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی قوم کے غلط کردار
کو بھی صحیح سمجھنے لگتا ہے۔ اپنی قومی ترقی کے مقابل دوسروں کے مفاد کی مطلق
پرواہ نہیں کرتا اور اپنی قوم کی برتری کا سکہ دنیا سے جبراً منوانا چاہتا ہے۔
آج کل دنیا میں زیادہ تر اسی قوم پرستی کا زور ہے جس نے دنیا کے امن وعافیت
کے لئے ایک مستقل خطرے کی شکل اختیار کر لی ہے اور اسی وجہ سے
"نیشنلزم" موجودہ سیاسیات کا اہم ترین مسئلہ بن گیا ہے۔

اصطلاحیں

"نیشنلزم" "نیشنلٹی" اور "نیشن" دور جدید کی سیاسی
اصطلاحیں ہیں۔ علم سیاسیات کے مفکرین کو ان کے معنی

ہیں اس قدر اختلاف ہے کہ یہ الفاظ بڑی حد تک مبہم ہو گئے ہیں تاہم ان کو الگ الگ سمجھنا ضروری ہے۔ "نیشنلزم" (قوم پرستی) جیسا کہ بیان کیا گیا انسان کی اُس ذہنی کیفیت کا نام ہے جس میں قومی تنگ نظری اور عصبیت نمایاں ہو اور قومیت نے جارحانہ اور جنگ جویانہ رنگ اختیار کر لیا ہو، نیشنلٹی (قومیت) اصطلاحاً انسانوں کی اس اجتماعی ہیئت اور تہذیبی وحدت کو کہتے ہیں جس کے افراد نسل، وطن، زبان، مذہب اور رسم و رواج وغیرہ کے اشتراکات کی وجہ سے باہم مربوط ہوں اور ایک قوم بن گئے ہوں۔ ان کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سیاسی حیثیت سے بھی ایک وحدت ہوں اور اپنی آزاد ریاست بھی رکھتے ہوں۔ تیسری اصطلاح "نیشن" (قوم) اس سے مختلف ہے۔ اس لفظ کے ساتھ سیاسی وحدت اور آزاد ریاست کا تصور بھی وابستہ سمجھا جاتا ہے، افراد کی ایسی جماعتیں جو سیاسی اغراض و مصالح کے ماتحت متحد ہو گئی ہوں اور جنھیں سیاسی اقتدار اعلیٰ حاصل ہو یا وہ اس کی خواہشمند ہوں تو وہ "نیشن" کہی جاتی ہیں۔ ان کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ افکار و خیالات، تاریخ و روایات، زبان و ادب اور اخلاق و معاشرت میں بھی آپس میں یکسانیت رکھتی ہوں، برطانوی قوم (نیشن) بحیثیت مجموعی اسکاچ، ولش، اور اینگلو سیکسن تین قومیتوں پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی انفرادی حیثیت بھی قائم کئے ہوئے ہے، اسی طرح سوسٹان کے لوگ جرمن، اطالوی اور فرانسیسی تین جداگانہ قومیتیں ہونے کے باوجود ایک قوم ہیں۔ سترھویں صدی میں یورپ میں لفظ نیشن سے "ایک ہی ریاست کے باشندے" مراد لئے

جاتے تھے خواہ وہ ہم نسل تھے یا نہ تھے۔ سر نارڈ جوزف اپنی کتاب "قومیت" میں لکھتا ہے کہ یہ لفظ بڑی حد تک اسی مفہوم میں اب تک استعمال ہوتا رہا ہے۔

ایک چوتھی اصطلاح "نیشنل" بھی قابل تشریح ہے۔ بین الاقوامی تعلقات میں ایک شخص اصطلاحاً اُس سلطنت کا "نیشنل" کہلاتا ہے جس کی وہ رعایا ہو مثلاً ایک ہندوستانی اگر ہندوستان سے باہر جائے تو وہ برٹش نیشنلٹی سے منسوب کیا جائے گا۔ یہاں نیشنلٹی سے مراد شہریت (Citizenship) ہے۔

باب ۲
قومیت کے عناصر

اس سے قبل بتایا جاچکا ہے کہ قومیت ایک خالص موضوعی جذبہ ہے اور اسی پر افراد کے مجموعوں کا اتحاد و استحکام منحصر ہے لیکن ساتھ ہی بعض معروضی عناصر بھی ہیں جن کے بغیر قومیت وجود میں نہیں آسکتی۔ ان میں نسل، وطن، زبان، مذہب، تاریخ، روایات اور تہذیب کے اشتراکات قومیت کے اہم ترین محرکات شمار کئے جاتے ہیں۔ دنیا میں جتنی قومیتیں بنیں ان کی بنیاد انھیں اشتراکات میں سے کسی نہ کسی پر ضرور قائم ہوئی۔ البتہ یہ ضروری نہیں کہ یہ تمام محرکات بہ یک وقت موجود ہوں یا وہ عنصر جو ایک قومیت بنانے میں مفید اور قوی ثابت ہوا ہے دوسری کی تعمیر میں بھی اتنا ہی اہم ثابت ہو۔ مثلاً ایک جگہ قومیت کی تعمیر میں مذہب کو جو اہمیت حاصل ہوگی اس کا دوسری جگہ پایا جانا لازمی نہیں۔ بہر حال اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان تمام اشتراکات کو جو قومیت کے عناصر قرار دئے جاتے ہیں قومیت کی تعمیر میں کس حد تک دخل ہے۔

نسل انقلاب فرانس کے زمانے سے نسل کو قوم کا اہم ترین عنصر شمار کیا جاتا ہے، پچھلے دنوں میں جرمنی کی نازسی (Nazi) جماعت

نے اس عنصر کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ لوگ جو ایک نسل سے ہوتے ہیں اپنے اندر یگانگت کا ایک فطری جذبہ پاتے ہی ہیں۔ چنانچہ تہذیب کے ابتدائی دور میں قومی جذبہ کا محرک نسلی اشتراک ہی ہوا اور قومیت کی تشکیل اسی طرح ہوئی کہ کئی کئی خاندان مل کر قبیلہ بنے اور قبیلے بعد میں قوموں کی شکل میں متحد ہوئے، اس نسلی رشتہ ہی کی وجہ سے ہر فرد یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی اور اس کی ہم قوموں کی رگوں میں ایک ہی خون ہے اس لئے ان کے درمیان کوئی مغائرت نہیں۔ یہی احساس رابطہ واتحاد کے جذبہ کو استوار کرنے کا باعث ہوا اور قومیت کی بنیاد بنا مگر موجودہ ملکوں اور قوموں کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دنیا میں شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جس پر باہر والوں نے حملے نہ کئے ہوں۔ اور مختلف نسلوں کے لوگوں میں باہمی شادی بیاہ نہ کیا ہو۔ آج نہ کوئی ایسی قوم ہے جو مخلوط نسلوں پر مشتمل نہ ہو اور نہ کوئی ایسی نسل ہے جس کے تمام افراد ایک قوم ہوں۔ انگلستان کے باشندوں کو اگر نسلیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ لوگ کلٹی، برطانوی، نورمنی انشر دی اور جرمن نسلوں سے پیدا ہیں اسی طرح جرمن قوم فرانکوں، اسلافیوں، شمالیوں اور جنوبیوں کی اولاد سے ہے لیکن آج انگریز بھی ایک قوم ہیں اور جرمن بھی۔ اسی طرح اطالیہ کے شمالی حصہ کے باشندے الپائن نسل سے ہیں اور جنوبی حصہ کے بحرۂ روم کی نسل سے لیکن یہ دونوں اطالوی قومیت میں متحد ہیں۔ اسی طرح اگر مشرق میں ہندوستان کو دیکھا جائے تو یہاں ایرانی یونانی، منگول اور دراوڑی نسلیں اس طرح خلط ملط ہیں کہ اس ملک کی

ایک نسل بھی اپنے بے میل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی، یہ تو ایک قوم میں مختلف
نسلوں کی مثالیں ہوئیں، اب ایک نسل کے مختلف قوموں میں منقسم ہونے کی
مثالیں لے لیجئے، فرانسیسی اطالوی اور سوس قومیں البائن نسل سے ہیں لیکن
ان میں سے ہر ایک جداگانہ قوم ہے اسی طرح سوئیڈن اور نارو ے،
پیرو اور چلی کے باشندے ایک بڑی حد تک ہم نسل ہیں لیکن اپنی جدا جدا قومی حیثیت
رکھتے ہیں۔ غرض ایک طرف تو مشکل ہی سے ایسے ملک ملیں گے جہاں کے
باشندے ہم نسل ہوں اور دوسری طرف محض نسلی اشتراک وجہ سے وہ لازمی
طور پر ایک قوم نہیں بن جاتے۔ اس میں شک نہیں کہ نسلی جذبہ ایک فطری سی
شے ہے اور قومیت کے احساس کو تقویت بھی پہنچا سکتا ہے۔ لیکن اسی
حالت میں ممکن ہے کہ قوم مختلف نسلی عناصر پر مشتمل نہ ہو یا اگر ہو تو یہ فرق بہت
زیادہ نہ ہو، کیونکہ قوم کی تشکیل اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کے
مختلف نسلی عناصر اپنے ذہنوں سے یہ بات فراموش نہ کر دیں کہ وہ ایک دوسرے
سے مختلف ہیں۔ اور آپس میں آزادانہ معاشرتی تعلقات اور شادی بیاہ کے
رشتے قائم نہ کریں۔ گویا ایک قوم بننے کے لئے معاشرتی زندگی میں مساویانہ
تعلقات قائم کر کے ایک نسل کو دوسری نسل میں ضم ہونا پڑے گا، ورنہ جس وقت
تک ایک عنصر میں بھی نسلی تفوق کا احساس باقی رہے گا وہ اپنی تہذیب کو برتر
سمجھ کر اسے دوسرے عناصر پر مسلط کرنے کا خواہشمند رہے گا اور ایسی حالت
میں قومی اتحاد کا پیدا ہونا ناممکن ہو گا۔ جرمنی اور روس میں مدت تک نسل کو قومیت
پیدا کرنے کا ذریعہ بتایا گیا۔ اور نسل پرستی کی تعلیم دی گئی۔ انیسویں صدی میں جرمن

فلسفی ٹرائٹشکے نے جرمن نسل کو دنیا کی تمام نسلوں سے اعلیٰ و برتر قرار دے کر جرمن قوم کو اس بات کا مستحق ٹھہرایا کہ پسماندہ قوموں میں تہذیب پھیلانے کی خدمت پر وہ اپنے آپ کو مامور سمجھے۔ نسلی افتخار کے جذبہ نے ہمیشہ دنیا کی ترقی یافتہ اور طاقتور قوموں میں بھی خواہش پیدا کی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کمزور قوموں سے برتر سمجھیں اور اُن پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ آج بھی ایسی قوموں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ غلبہ و حکمرانی کی مستحق ہیں اور پسماندہ قومیں محکومی اور غلامی کی۔

نسل کو قومیت کا سبب قرار دینے اور نسلی اشتراک پر زور دینے والوں کا مسلک ہمیشہ جنگجویانہ اور جارحانہ وطن پرستی رہا ہے۔ یہ لوگ اپنے ملکی اور سیاسی اغراض کی خاطر قوم کے جذبۂ افتخار و انانیت کو نسل کے نام پر ابھارتے ہیں۔ اور خاطر خواہ فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ ہٹلر نے اپنے سیاسی اغراض کی خاطر یہودیوں کو غیر نسل قرار دے کر جرمنی سے نکالا اور یہ دعویٰ کیا کہ جرمنی کی قومی تنظیم نسلی بنیاد پر کی جائے گی حالانکہ اپنی کتاب "مائن کامف" میں خود اس کا اقرار کیا ہے کہ جرمنی میں نسلی یکسانیت مفقود ہے[۵]۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ نسلی اشتراک کا عقیدہ خواہ صحیح ہو یا غلط قومیت کے احساس کو شدید کر دینے میں ہمیشہ مددگار رہا ہے اور اب بھی ہے۔

وطن | وطن کا اشتراک دنیا میں جذبۂ قومیت کے لئے ایک قوی محرک

---

[۵] صفحہ ۲۹۴

ثابت ہوا ہے۔ وطن ہی کی سرزمین پر افراد کی قومی زندگی نشو و نما پاتی ہے،
ان کی تاریخ بنتی ہے۔ روایات قائم ہوتی ہیں۔ زبان و ادب ترقی کرتے ہیں
اور معاشرت و مذہب پھلتے پھولتے ہیں۔ یہی چیزیں ان میں یگانگت کا وہ
احساس پیدا کر دیتی ہیں جو ان کو ایک قوم بنا دیتا ہے۔ پھر ان کی قومی سیرت
کی تشکیل بھی وطن ہی کی سرزمین پر ہوتی ہے اور یہیں روزمرّہ کی زندگی میں اس
سیرت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ان تمام وجوہ سے وطن کا اشتراک قومیت کا
ایک لازمی جزو بن جاتا ہے۔

وطن کے قدرتی حالات بھی افراد میں احساسِ جمعیت پیدا کرنے میں نمایاں
حصہ لیتے ہیں۔ انسان کے جسم، دماغ اور نفسیات پر اُس کے ملک کے قدرتی
حالات کا گہرا اثر ہوتا ہے چونکہ یہ حالات ایک ملک میں بہت کچھ یکساں ہوتے
ہیں اس لئے ان کا اثر بھی اہلِ ملک پر یکساں ہوتا ہے۔ ان کے جذبات و حسیات
افکار و خیالات میں ایک قسم کی یکسانی پیدا ہو جاتی ہے اور یہی یکسانی اُن میں باہمی
انس و تفاہم پیدا کر دیتی ہے۔ یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ انسان کو اُس شخص
کے ساتھ زیادہ تعلق خاطر ہوتا ہے جس کو وہ اپنے آپ سے مشابہ پاتا ہے
اور جسے وہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے، اُسے اپنے ہمسایہ کے مقابلہ میں دور
کے رہنے والوں سے زیادہ لگاؤ نہیں ہوتا کیونکہ ان کی طبعی خصوصیات سے
وہ پورا پورا واقف نہیں ہوتا۔ اسی طرح اپنے ہموطنوں کے مقابلہ میں دوسرے
ملک والوں سے اُسے زیادہ ہمدردی نہیں ہوتی۔ ہموطنوں میں باہمی ہمدردی کا
یہی جذبہ اتحاد و ارتباط پیدا کر دیتا ہے اور اُن کو قومیت کے رشتہ میں جوڑ دیتا ہے

یہی وجہ ہے کہ دنیا میں قومیت کے جذبہ کو اُبھارنے میں وطن کا نام اور وطن کا ذکر ہمیشہ مفید ثابت ہوا ہے۔ اطالوی قومیت کا مشہور علمبردار میزینی اپنی ایک تقریر میں اپنے ہموطنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

" ہمارا ملک ہمارا وطن ہے یہ ہمیں خدا کی طرف سے عنایت ہوا ہے، اس میں بسنے والوں سے ہم محبت کرتے ہیں۔ اور وہ ہم سے محبت کرتے ہیں۔ غیروں کے مقابلہ میں ہمیں ان کے ساتھ زیادہ ہمدردی ہے اور ان کو ہم جلد سمجھ سکتے ہیں۔"

" یہ وہ سرزمین ہے جس میں تمھارے آباؤ اجداد آرام کر رہے ہیں......... یہاں رہ کر تم اپنے اندر وہ اوصاف پیدا کر سکتے ہو جو تمھیں خدا سے ملا دیں۔ وطن ہی سے تمھاری آبرو ہے یہی تمھاری عظمت کا سبب ہے اور یہی تمھیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے"

قومی تہذیب و تمدن کی ترقی کے لئے بھی وطن کا وجود ضروری ہے۔ کوئی قوم اس وقت تک پوری پوری ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اُس کے ہر فرد کو ترقی کے لئے ایک ہم آہنگ ماحول میسر نہ آجائے ۔ یہ ماحول صرف وطن ہی کی سرزمین مہیا کر سکتی ہے ۔ یہیں وہ اپنے ہم مذاق ہم مزاج اور ہم خیال لوگ پا سکتا ہے اور یہیں اُس کے جذبات و احساسات اور میلانات و رجحانات کو ایسی مانوس فضا مل سکتی ہے جس میں اُس کی شخصیت اپنے پورے نشو و نما کو پہنچ سکے، اس کے گرد و پیش کی اجتماعی زندگی اس کے اندر تخلیقی تحریک پیدا کرتی ہے اور اس کے عمل کی

صلاحیتوں کو بر روئے کار لاتی ہے، اور اس کی وطنی تاریخ، اُس کے عزائم اور مقاصد کو جوش میں لاتی ہے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ افریقہ کے ان خانہ بدوش قبائل میں جن کو جپسی ([illegible]) کہا جاتا ہے معاشرتی زندگی پیدا نہ ہونے کا یہی سبب ہوا کہ اُن کا کوئی مستقل وطن نہ تھا جہاں اُن کی اجتماعی زندگی جڑ پکڑتی۔ اور ان کی تاریخ اور روایات قایم ہو سکتیں اس کے برخلاف ان علاقوں میں جو اپنے طبعی حالات کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ تھے مثلاً مصر اور حبشہ اجتماعی زندگی آسانی سے پیدا ہو سکی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا میں قومی زندگی کے پیدا کرنے میں وطن کا کتنا حصہ ہے۔

مدتوں تک ایک ہی ملک کی سرزمین پر رہنے کے سبب اور ایک ہی قسم کے جغرافی حالات میں زندگی گزارنے کی وجہ سے اہل ملک کی اقتصادی ضروریات سیاسی اغراض اور ملکی اور ملی مفاد یکساں ہو جاتے ہیں۔ اور وہ آپس میں یکسانی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ باوجود آپس کے سیاسی اختلافات کے اس قسم کے لوگوں نے وطن کی حفاظت اور قومی عزت کے رکھ رکھاؤ کے لئے سیاسی اتحاد قائم کر لئے ہیں۔ اور متحدہ قومی ریاستیں بنالی ہیں۔ چنانچہ یورپ کی موجودہ قومی ریاستیں اسی طرح وجود میں آئیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ حُبِ وطن نے ایسی ایسی جماعتوں کو رشتۂ اتحاد میں جوڑ دیا جو نسل، زبان اور مذہب میں بھی ایک دوسرے سے مختلف تھیں، ان تمام اختلافات پر حبِ وطن کا جذبہ غالب آیا اور وہ

ایک قوم بن گئیں۔

زبان

قومیت کے عناصر میں مشترکہ زبان کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، برنارڈ جوزف کا خیال ہے کہ قومیت پیدا کرنے میں مشترکہ زبان تمام دوسرے عناصر پر فوقیت رکھتی ہے[۱]۔ ایک دوسرا مصنف ریمزے میور کہتا ہے کہ قومیت کی تعمیر میں مشترکہ زبان کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

مشترکہ زبان رکھنے والوں کے احساسات، جذبات، خیالات اور نظریات ہمیشہ ایک سے ہوتے ہیں وہ ایک ہی طریقے پر بات کو سوچتے اور محسوس کرتے ہیں۔ زندگی کے اکثر معاملات میں ایک ہی طرح کے زاویہ ہائے نگاہ رکھتے ہیں، ان کے اخلاق کا معیار اُن کے طور طریقے ان کا ادب سب یکساں ہو جاتے ہیں گویا ان کی نفسیاتی حالت میں یکسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی یکسانی کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے احساسات کو سمجھنے لگتے ہیں، اور ایک دوسرے کی عادات و خصائل سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ اس باہمی اُنس و تفاہم کی وجہ سے وہ ایک گروہ اور ایک جماعت بن جاتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو ایک قوم سمجھنے لگتے ہیں۔

ادب جس کا دارومدار زبان پر ہے قومیت کے جذبہ کو ترقی دینے میں بہت مدد دیتا ہے۔ ادب انسان میں جذبۂ تخلیق پیدا کرتا ہے اور اس کو

---

[۱] صفحہ ۴۵

بلند نگاہ اور بلند خیال بناتا ہے۔ مشترک ادب سے قوم کے تمام افراد کی ذہنی تربیت ایک ہی نہج پر ہوتی ہے اس لئے وہ سب آپس میں ایک طرح کا ذہنی رابطہ اور اتحاد محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یگانگت کے اسی احساس کی وجہ سے ان میں قومی اتحاد کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ادب کا وہ حصہ جو قومی کہانیوں اور گیتوں پر مشتمل ہوتا ہے قومی خیالات کو ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچاتا رہتا ہے۔ قومی زندگی جن دشواریوں اور آزمائشوں سے گزرتی ہے اس کی یاد اسی حصہ ادب سے تازہ ہوتی ہے۔ اور اسی کے ذریعہ قومی عظمت کی روایات ماضی سے حال اور حال سے مستقبل تک پہنچتی رہتی ہیں۔ اور قومیت کی بنیادوں کو استوار کرتی رہتی ہیں۔ قومی شاعری نے دنیا کے ملکوں میں قومیت کو ابھارنے اور اس کو قائم رکھنے میں جو حصہ لیا ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اطالوی قومیت کے بانی میزنی کی شاعری ملکی زبان ہی میں تھی۔ اور اس شاعری ہی کی بدولت اس نے ملک میں ایک سرے سے دوسرے تک قومیت کی لہر دوڑا دی۔ اور اطالیہ کے باشندوں کو ایک قوم بنا دیا۔

اُنیسویں صدی سے یورپ میں اکثر زبان ہی کو قومیت کی اساس قرار دیا جاتا ہے۔ آسٹریا ہنگری کی سلطنت کی آبادی مختلف زبانیں بولتی تھی، سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد جب اس سلطنت کو آزاد قومی ریاستوں میں تقسیم کیا گیا تو زبان ہی کو اس تقسیم کا معیار قرار دیا گیا۔ جنگ عظیم سے قبل اور اس کے بعد یورپ میں قومیت کے اصول کے ماتحت یوگوسلاویا، بلغاریہ، لیٹ دیا،

لتھونیا، اسٹونیا، فن لینڈ، چیکوسلوواکیہ وغیرہ جتنی قومی ریاستیں وجود میں آئیں اُن کی قومیت کا معیار زبان ہی کو قرار دیا گیا۔ یہ تمام قومیں اپنی اپنی علیحدہ زبانیں بولتی ہیں اور اپنی زبان ہی کو ہر قوم اپنی قومیت کی بنیاد سمجھتی ہے۔

دنیا میں ایسی مثالیں بھی ہیں جہاں نہ لسانی اشتراک قومیت پیدا کر سکا نہ لسانی اختلاف قومیت کے جذبہ کو روک سکا۔ انگلستان، کناڈا، آسٹریلیا اور امریکہ کی ریاستہائے متحدہ میں انگریزی زبان بولی جاتی ہے۔ لیکن یہ چاروں جُدا جُدا قومیں ہیں۔ اسی طرح وسطی امریکہ اور جنوبی امریکہ میں زیادہ تر اسپینی زبان بولی جاتی ہے۔ لیکن اسپین کے ساتھ قومی اتحاد قائم کرنے کی خواہش کبھی ان ملکوں میں پیدا نہ ہوئی۔ دنیا میں تقریباً بیس قومیں اسپینی زبان بولتی ہیں لیکن ہر ایک جُدا جُدا قوم ہے۔ اس کے خلاف اسکاٹستان اور سوئٹستان کی مثالیں ایسی ہیں جہاں لسانی اختلاف کے باوجود قومیت پیدا ہو سکی۔ اسکاچ قوم گال اور انگریزی دونوں زبانیں بولتی ہے مگر ایک قوم ہے۔ اسی طرح سوس قوم فرانسیسی، اطالوی، اور جرمن تینوں زبانیں بولتی ہے مگر متحدہ قوم ہے۔ ان مثالوں سے قومیت کی تعمیر میں زبان کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی، ان ملکوں میں قومیت کے لئے دوسرے قومی محرکات موجود رہے۔ اس لئے لسانی اشتراک کی مدد کے بغیر قومیت وجود میں آ گئی۔

ہمارے ملک میں بھی آج کل زبان کے مسئلہ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں، مشرقی ممالک کی قومیت میں عموماً اُن عناصر کو دخل نہ تھا جن پر مغربی قومیت کا دارومدار ہے لیکن اب رفتہ رفتہ مغربی تخیل مشرق کی طرف

بھی قدم بڑھا رہا ہے، گذشتہ دنوں فلسطین میں جب قومیت کا مسئلہ درپیش ہوا تو وہاں بھی زبان ہی کو معیار قرار دیا گیا۔ چنانچہ عربی بولنے والے مسلمان اور عیسائی ایک قوم قرار دئے گئے اور عبرانی بولنے والے یہودی دوسری قوم۔

مذہب

میزنی کا خیال ہے کہ قومیت کی تعمیر کے لئے مذہبی اشتراک سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ایک جماعت کے افراد میں معاشرتی ارتباط و اتحاد اسی وقت ممکن ہے جبکہ ان کے مذہبی عقائد مشترک ہوں۔ مذہب ان کو اخلاق کے ایک ہی قانون پر مجتمع کرتا ہے اور ان کے سامنے ایک ہی قسم کے مقاصد پیش کرتا ہے اس لئے ان میں مشترک اخلاقی خصائص پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے نظریات اور طرز زندگی ایک ہی طرح کے ہو جاتے ہیں اور وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ایک ہی رشتہ میں منسلک ہیں۔ گویا روحانی اور اخلاقی حیثیت سے وہ ایک جماعت بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد دنیوی مقاصد میں ان کا متحد ہوجانا مشکل نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے میزنی نے جب اپنے ہموطنوں کو ایک متحدہ قوم بنانا چاہا تو اُن کو یہی مشورہ دیا کہ مذہب کی تعلیم کو ملک میں عام کریں اور مذہبی معاملات میں فکر و نظر سے کام لیں۔ اس کو یقین تھا کہ مذہبی شغف و انہماک اُن کے اندر اتحاد کا جذبہ پیدا کر دے گا۔ اتحاد ایک طرف تو ان کی روحانیت کو ترقی دے گا اور دوسری طرف اُن کے دلوں میں دنیوی زندگی میں کامیابی کی خواہش پیدا کرے گا۔ وہ زندگی کی غرض و غایت کو سمجھیں گے اور اُس کی تکمیل کے لئے کوشش کریں گے۔ اس طرح مذہب کے ذریعہ ان کی عمل کی قوتیں بیدار

ہوسکیں گی ۔ اور ان کے لئے دنیوی ترقی کی راہیں کھل جائیں گی ۔ اس میں شک نہیں کہ مذہب کی بدولت انسانوں میں مشترک اخلاقی معیار پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ ذہنی، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے ایک وحدت بن جاتے ہیں۔ تاریخ کے قدیم عہد میں انسانی جماعتوں میں مذہبی عقائد اور رسم ورواج کے اشتراک ہی نے قومیت کا جذبہ پیدا کیا ۔ چنانچہ یورپ اور ایشیا کی بعض قوموں میں قومی جذبہ کا محرک مذہب ہی ہوا ۔

ایشیا میں تو اب بھی قومیت کا دارو مدار مذہب ہی پر ہے ۔ ہندوستان میں ہندو مسلمان سکھ اور پارسی مذہب ہی کی وجہ سے جُدا جُدا قومیں ہیں ۔ اسلام کی قومیت کی بنا ر مذہب پر ہے ۔ جاپان کا قومی اتحاد مذہب کا رہین منت ہے، ارمنی اور قبطی قوموں میں مذہب اور قومیت لازم و ملزوم ہیں ۔ یہودیوں کی قومیت میں مذہب کو زبردست دخل رہا ہے ۔ یورپ میں بھی اسکاچ اور آئرش قومیں مذہب ہی سے بنی ہیں لیکن مغربی ملکوں کی جدید قومیت میں مذہب کو بہت تھوڑا دخل ہے، یورپ کی بڑی بڑی قومیں اکثر و بیشتر ایسی ہیں جو متضاد مذہبی عقائد رکھنے والی جماعتوں پر مشتمل ہیں ۔ انگلستان میں کیتھولک مذہب کے ماننے والے بھی ہیں اور پروٹسٹنٹ بھی، یہی صورت جرمنی اور اطالیہ میں ہے اور یہی حال امریکہ میں ہے مگر ان میں سے ہر ایک متحدہ قوم ہے ۔ امریکہ کا مشہور مورخ (Hayes) لکھتا ہے کہ " موجودہ قومیں زیادہ تر ایسی ہیں جو مذہبی رسوم و عقائد کی یکسانی بغیر بھی پوری پوری ترقی کر سکی ہیں "۔ سچ تو یہ ہے کہ یورپ نے اگر کبھی کوشش بھی کی ہے کہ مذہبی اتحاد کو سیاسی اتحاد

کی بنیاد بنائے تو وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہوا اور یہی وجہ ہے کہ اُسے آخر کار مذہب کو سیاست سے جُدا کرنا پڑا۔ درحقیقت مذہب کی روح قومیت کے اُس موجودہ فلسفہ سے جو مغرب کی ایجاد ہے کسی نوع متفق ہو ہی نہیں سکتی۔ دنیا کے تمام مذاہب عام مساوات اور رواداری کا سبق دیتے ہیں اور تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری قرار دیتے ہیں۔ مغربی قوم پرستی کی تنگ نظری میں پڑ کر انسان اس اصول کی حمایت نہیں کر سکتا۔

تہذیب ایک قوم کے افراد میں باہمی اُنس و تفاہم پیدا کرنے کا سب سے بڑا سبب تہذیبی اشتراک ہوتا ہے۔ جو لوگ مشترک تہذیب رکھتے ہیں ان کے جذبات، حیات افکار و خیالات علوم و فنون رسم و رواج زبان و ادب تاریخ و روایات یکساں ہوتے ہیں۔ ان کی سیاسی تہذیب کے مشترک معیار ہوتے ہیں۔ زندگی کے تمام اہم معاملات میں ان کے فکر کا رخ اکثر ایک ہی سا ہوتا ہے۔ اُن کا طرز زندگی ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ ان میں ایک ہی طرح کے اخلاق و اوصاف پائے جاتے ہیں، ان کے مقاصد اور حوصلے یکساں ہوتے ہیں، ان کے قلبی اور روحانی تاثرات ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ انھیں ذہنی، معاشرتی، اخلاقی اور روحانی اشتراکات کی وجہ سے وہ ایک جماعت اور ایک قومیت بن جاتے ہیں۔ چونکہ اس قومیت کی بنیاد تہذیب پر ہوتی ہے اس لئے یہ قومیت تہذیبی قومیت کہلاتی ہے، جن چیزوں سے تہذیب کو تقویت پہنچتی ہے وہی چیزیں اس قومیت کے جذبہ کو بھی تقویت پہنچاتی ہیں۔ اس ضمن میں قومی ادب، قومی تعلیم اور

قومی روایات کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

قومی ادب کے متعلق برنارڈ جوزف لکھتا ہے کہ "اس کا قومیت کی ترقی میں نمایاں حصہ ہے۔ اسی کے ذریعہ قومی روایات بنتی ہیں اور زندہ رہتی ہیں۔ اور اسی کے ذریعہ قومی تاریخ کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے"[۵۱] یہی مصنف قومی تعلیم کے متعلق لکھتا ہے کہ "اس کے ذریعہ افراد میں مشترک اخلاقی اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے مشترک معیار قائم ہو جاتے ہیں۔ اکثر معاملات میں مشترک زاویہ ہائے نگاہ بن جاتے ہیں اور ان میں باہم معاشرتی رابطہ پیدا ہو جاتا ہے"[۵۲] ان تمام اشتراکات کی وجہ سے افراد کے خیالات و احساسات میں یکسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے ہیں اور عمل میں ایک دوسرے کے ساتھ شرکت کرنے کو آسانی سے تیار ہو جاتے ہیں۔ تعامل و تعاون کا یہی جذبہ ان کو ایک قومیت بنا دیتا ہے۔

قومیت کے لئے تیسری مفید چیز قومی تاریخ و روایات کا سرمایہ ہے۔ ان شخصیتوں کے حالات جن کی سیرت میں قومی مقاصد اور حوصلے نمایاں ہوتے ہیں قومی تاریخ پیدا کرتے ہیں۔ اس تاریخ سے قومیں عزم و ہمت کا سبق لیتی ہیں۔ اور اپنے لئے قومی غیرت اور خودداری کے نصب العین قائم کرتی ہیں

---

۵۱ Nationality مصنفہ B. Joseph صفحہ ۱۱۴

۵۲ ایضاً ایضاً صفحہ ۱۱۸

اسی طرح اپنے جانبازوں کے کارناموں اور مصائب کی یاد جو قومی کہانیوں اور نظموں کی شکل میں ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتی ہے قومی روایات قائم کرتی ہے۔ انھیں روایات میں سے قومی جذبہ کی سوتیں پھوٹتی ہیں، قومی ایثار اور قربانی کی مثالیں آنے والی نسلوں کو قومی خدمت کا ذولہ بخشتی ہیں۔ یورپ میں ڈچ، سوئسی، اسکاچ اور آئرش قوموں میں قومیت کا جذبہ پیدا کرنے میں ان مشترک مصائب کی یاد کو بہت دخل ہے جو قومی آزادی کی خاطر انھوں نے برداشت کی ہیں۔

ریاست ریاست کے لغوی معنی ایک ایسے مجموعۂ افراد کے ہیں جن کا کوئی سرگروہ یا رئیس ہو لیکن سیاسی اصطلاح میں اس لفظ کا انطباق افراد کی اس کثیر تعداد پر کیا جاتا ہے جو متحد اور منظم ہو کسی مخصوص جغرافی رقبے میں سکونت پذیر ہو، حکومت کرنے کے لئے جس نے قانون وضع کیا ہو اور اس قانون کا اتباع اس کی اکثریت معمولاً کرتی ہو۔ چونکہ ریاست انسانوں کی ایک ایسی منظم جماعت ہے جس میں افراد سیاسی رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں اور اُن کے قوانین اور سیاسی ادارے ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں اس لئے وہ باہم گربستہ و پیوستہ ہو جاتے ہیں اور ایک قوم بن جاتے ہیں لیکن اب تک اس مسئلہ میں بڑا اختلاف رہا ہے کہ آیا ریاست سے قومیت پیدا ہوتی ہے یا قومیت کی وجہ سے ریاست وجود میں آتی ہے۔ ایک طرف ہمارے سامنے برطانیہ کی مثال ہے جہاں باوجودیکہ ایک ریاست قائم ہے تین قومیتیں اینگلو سیکسن، اسکاچ، اور ولش موجود ہیں۔ اور دوسری طرف سوئستان

ولندستان، اور چیکوسلوواکیہ اور دوسرے بہت سے ممالک کی مثالیں ہیں جو اپنے نسلی، لسانی اور مذہبی اختلافات کے باوجود محض ریاست ہی کی وجہ سے متحد قومیں بن گئی ہیں۔ اسی طرح ایسی مثالیں بھی کچھ کم نہیں ہیں جن میں قوموں نے اپنی قومیت کے احساس کی وجہ سے سیاسی آزادی کا دعویٰ کیا اور اپنی ریاست قائم کی۔ مثلاً ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد آسٹریا ہنگری کی سلطنت جتنی ریاستوں میں بٹی وہ سب ریاستیں قومیت ہی کی بنیاد پر قائم کی گئیں، ساتھ ہی ساتھ ایسی مثالیں بھی بکثرت ہیں جن میں یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ قومیت کی وجہ سے ریاست پیدا ہوئی یا ریاست قومیت کے پیدا ہونے کا باعث ہوئی۔ ہمارے سامنے یہ تاریخی حقیقت بھی ہے کہ موجودہ ریاستوں کے وجود میں آنے سے پہلے بھی دنیا میں قومیتیں موجود تھیں۔ ایسی قوموں کی مثالیں بکثرت موجود ہیں جن کی سیاسی آزادی فاتح اقوام کے ہاتھوں ختم ہوئی ان کے قوانین مٹے اور سیاسی ادارے برباد ہوئے، پھر بھی وہ اپنی قومیت کو زندہ اور برقرار رکھ سکیں۔ مصری سلطنت، اشوری سلطنت، سکندر اعظم کی سلطنت، رومی، ترکی، روسی، آسٹروی اور برطانوی سلطنتوں میں بے شمار قومیں تھیں، جو مفتوح بنیں اور ان کے قوانین اور سیاسی ادارے مٹے، بایں ہمہ وہ اپنی قومی ہستی برقرار رکھ سکیں، اسی طرح یونانی، جرمن اور اطالوی قوموں میں صدیوں تک سیاسی اتحاد مفقود رہا اس کے باوجود وہ قومیں رہیں، ان تمام واقعات پر نظر ڈالنے کے بعد ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ریاست اپنے مشترک قوانین اور سیاسی اداروں کی وجہ سے قومیت کے احساس کو برقرار

رکھنے اور تقویت پہنچانے کا ذریعہ ضرور ہے، لیکن اسے ہم اس تہذیبی قومیت کا باعث قرار نہیں دے سکتے جن کے اصول کا تجزیہ گزشتہ اوراق میں کیا جا چکا ہے۔

برنارڈ جوزف قومیت اور ریاست کو دو مختلف کیفیات قرار دیتا ہے اور یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ چونکہ ریاست کے برباد ہو جانے کے بعد بھی قومیت باقی رہ سکتی ہے اس لئے "ریاست اور قومیت کو ہم معنی کیفیات سمجھنا سراسر غلط اور حقیقت سے دور ہے[۵۱]" ایک دوسرا مورخ ہیز بھی یہی رائے پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "قومی ریاست کی بنیاد قومیت پر ہوتی ہے مگر قومیت قومی ریاست کے بغیر بھی قائم رہ سکتی ہے۔ ریاست لازماً ایک سیاسی کیفیت ہے اور قومیت اولاً تہذیبی اور ضمناً سیاسی[۵۲]"

جغرافی وحدت کہا جاتا ہے کہ ایک ہی ملک کے اندر بسنے والے لوگ اپنے آپ کو ایک قوم سمجھنے لگتے ہیں۔ چونکہ ان کے ملک کے جغرافی حالات دوسرے ملکوں کے حالات سے مختلف ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنے آپ کو بھی دوسرے ملکوں کے بسنے والوں سے مختلف سمجھنے لگتے ہیں۔ اس نظریہ میں بہت تھوڑی حقیقت ہے۔ جاپان یا برطانیہ کی علیحدہ علیحدہ قومیں بن جانے کو تو بلاشبہ طبعی حالات کے اختلاف پر محمول کیا

---

۵۱ Nationality مصنفہ B. Joseph صفحہ ۳۲۴

۵۲ Essays on Nationalism مصنفہ C. J. H. Hayes صفحہ ۵

جا سکتا ہے لیکن یورپ میں ایک ہی جغرافی حدود کے اندر اور ایک ہی سے
طبعی حالات رکھنے والے ملکوں میں جو کئی کئی قومیں پائی جاتی ہیں اس کو کسی طرح
جغرافی حالات کا نتیجہ قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ خود برطانیہ کے اندر چار قومیں
ہیں۔ اسکاچ، آئرش۔ اینگلو سیکسن اور ویلش، اسی طرح جزیرہ نما آئبریا میں
پرتگالی کیسٹیلی، کٹیالی۔ اور باسک قومیں موجود ہیں۔ یورپ کے میدان عظیم
کے حالات ایک سرے سے دوسرے تک قریب قریب یکساں ہیں مگر
اسی میدان کے بسنے والوں میں پول اور مگیا۔ دو قومیں موجود ہیں۔ جرمنی اور
فرانس کے حالات بھی بہت کچھ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ مگر کوئی
نہیں کہہ سکتا کہ یہ دونوں قومیں ایک ہیں۔ وسطی اور مشرقی یورپ کے ممالک میں
تو باوجود طبعی حالات کی یکسانی کے ایک ایک ملک میں کئی کئی قومیں آباد ہیں
اور ہر قوم اپنی جداگانہ قومی انفرادیت رکھتی ہے۔ جرمن، مگیا، چیخ، پول،
سلافی، یہودی اور دوسری قومیں صدیوں سے ایک جگہ زندگی بسر کر رہی ہیں
مگر آج تک ایک دوسرے میں ممزوج نہیں ہوئیں۔

معاشی اغراض

جن افراد کے معاشی اغراض مشترک ہوتے ہیں ان میں اپنے حقوق و مفاد کے تحفظ کے یکساں جذبات
پائے جاتے ہیں۔ یہ یکسانی ان میں وہ وحدت پیدا کر دیتی ہے جو انھیں ایک
قوم بننے میں مدد دیتی ہے۔ اس کی مثال ہمیں جاپانیوں کی قومیت میں ملتی ہے،
جاپان اپنے رقبے کے لحاظ سے ایک بہت چھوٹا سا ملک ہے اور اس کے
معاشی وسائل اور ذرائع بھی بہت محدود ہیں اس لئے قدرتی طور پر جاپانی بضرورت

محسوس کرتے ہیں کہ اپنی نوآبادیاں قائم کریں اور اپنی تجارت کے لئے منڈیاں پیدا کریں۔ اس جدوجہد میں وہ سب یکساں طور پر مصروف ہیں۔ چنانچہ دوسرے اسباب کے ساتھ ساتھ معاشی اغراض کا اشتراک بھی ان کی قومیت کا ایک سبب بن گیا ہے۔ اسی طرح آسٹریلیا کے سفید فاموں میں مشترک معاشی اغراض کی وجہ سے وہ وحدت پیدا ہو گئی ہے جس نے انھیں ایک جداگانہ قوم بننے میں مدد دی ہے انھوں نے اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے آسٹریلیا میں غیر قوموں کی مہاجرت پر پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انھیں ڈر ہے کہ اگر یہ پابندیاں اٹھا دی گئیں تو جاپان کے باشندے آسٹریلیا میں آبسیں گے اور اس طرح ان کے معاشی اغراض کو نقصان پہنچے گا۔ مشترک معاشی اغراض افراد کو متحد تو کر سکتی ہیں مگر یہ ناممکن ہے کہ محض اس قسم کا اشتراک ہی قومیت پیدا کرنے کے لئے کافی ہو۔ اگر محض معاشی اغراض کا اشتراک ہی قومیت پیدا کر لینے کے لئے کافی ہوتا تو شاید دنیا کی قومیں بس مزدوروں اور سرمایہ داروں ہی پر مشتمل ہوتیں۔

نظام حکومت مشترکہ نظام حکومت کو بھی قومیت کا سبب بتایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نظام حکومت کا اشتراک رعایا کو مشترک نظم ونسق کے رشتے میں منسلک کر دیتا ہے اور ایک ہی فرمانروا کی فرماں برداری ایک ہی قانون کی اطاعت اور ایک ہی ریاست کی وفاداری افراد میں سیاسی وحدت پیدا کر دیتی ہے لیکن اس قسم کی سیاسی وحدت بجائے خود کوئی مستحکم قومیت نہیں پیدا کر سکتی۔ جب تک سلطنت کو غلبہ و اثر حاصل رہتا ہے

رعایا کے مختلف عناصر مربوط رہتے ہیں لیکن جوں ہی مرکزی طاقت میں کمزوری پیدا ہوتی ہے یہ عناصر منتشر ہو جاتے ہیں اور اپنی جدا جدا قومیتیں بنا لیتے ہیں۔ سلطنت مغلیہ، سلطنت عثمانیہ، زار روس کی سلطنت اور اسٹریا ہنگری کی سلطنت میں مرکزی طاقت کے ٹوٹتے ہی قومیت کے تمام عناصر جدا جدا ہو گئے۔ ریمزے میور اپنی کتاب "قومیت اور بین الاقوامیت" میں لکھتا ہے کہ نظام حکومت کا اشتراک خواہ کتنا ہی مستحکم کیوں نہ ہو بجائے خود قومیت کی تعمیر نہیں کر سکتا۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمیشہ فرمانرداؤں کی یہ کوشش کہ اپنی ریاست میں سیاسی وحدت قایم کریں قومیت کے جذبہ کو تقویت پہنچانے کا باعث ہوئی، تاریخ کے ابتدائی دور میں جب کوئی قبائلی ریاست وسیع ہوئی اور کئی قبائل ایک نظام حکومت کے مطیع ہوئے تو ریاست کے فرمانروا کی پہلی کوشش یہ ہوئی کہ ان مختلف قبائل کو مشترک زبان اور مشترک رسم ورواج کے ذریعہ ایک قوم بنا دیا جائے۔ چنانچہ قدیم عہد کی اکثر اقوام اسی طرح وجود میں آئیں۔ عبرانی، مصری اور لاطینی اپنی سیاسی وحدت ہی کی وجہ سے قوم بنے۔ اسی طرح قرون وسطیٰ میں یورپ کی فرانسیسی انگریزی اور اسپینی قومیں بھی اپنے فرمانرواؤں ہی کی کوششوں سے متحدہ قومیں بنیں۔ آج بھی ہٹلر اور مسولینی کی کوششوں نے جرمن اور اطالوی قوموں کی قومیت کو غلو کی حد تک پہنچا دیا ہے فرمانرواؤں کا ظلم و استبداد بھی قومیت کے لئے ایک قوی محرک ثابت ہوا ہے۔ زیمرن اپنی کتاب "قومیت اور حکومت"

میں لکھتا ہے کہ " کہ یورپ میں سیاسی تعدی کی وجہ سے مظلوم قوموں میں اپنی قومی خودی کا احساس نہایت شدت کے ساتھ اُبھرا ہے"[۵] اسپینی قوم میں نیپولین کی جنگوں کے بعد قومیت کا جذبہ نہایت شدت کے ساتھ رونما ہوا۔ اسی طرح پولستان کی آزادی کو اس کی ہمسایہ طاقتوں نے ختم کرنے کی جتنی زیادہ کوشش کی پول قوم میں قومیت کا جذبہ اتنا ہی زیادہ بڑھا، آئرستان اور ہندوستان میں قومی جذبہ کا فروغ بھی اسی نوع کی مثال ہے۔

ارادۂ عامہ قومیت دراصل انسانوں کی اُس نفسیاتی حالت کا نام ہے جس میں وہ یہ تصور کر لیتے ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ یہ تصور اُن تمام تصورات اور داعیات کو مغلوب کر لیتا ہے جو افراد کو یا افراد کے مجموعوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والے ہیں۔ ہم نے قومیت کے عناصر کی بحث کے سلسلہ میں دیکھا کہ ہر وہ عنصر جس سے قومیت بنتی ہے انسانوں میں وہ نفسیاتی حالت پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ اپنے آپ کو ایک دوسرے سے بستہ و پیوستہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اور اُن میں قومی خودی کا تصور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس تصور کے ساتھ اُن کو جو عشق ہوتا ہے اس کی وجہ سے ان کا ہر فرد اپنی انفرادی خودی کو قومی خودی میں جذب کر دیتا ہے۔ قومی خودی کے تصور کے ساتھ اُن کے دل و دماغ کی یہی وابستگی

---

[۵] Nationality and Government از A. E. Zemmern. مصنف صفحہ ۴۷

قومیت کہلاتی ہے۔ چونکہ اپنے ایک قوم ہونے پر افراد کا یقین ہی بس قومیت کا معیار ہے اس لئے اس وقت تک وہ ایک قوم نہیں بن سکتے جب تک ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہو جانے کی خواہش اور اس کا ارادہ ان کے دل ودماغ میں کارفرمانہ ہو۔ اسی وجہ سے اکثر مصنفین نے اس مشترک خواہش اور ارادہ ہی کو قومیت کا سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے ۔ میزنی جس کو قومیت کا موجد کہا جاتا ہے اس ارادے کو قومیت کی بنیاد قرار دیتا ہے ۔

باب ۳

قومیت کا ارتقاء

قومیت کا جذبہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود انسان کا تمدن۔ انسان کی معاشرتی تنظیم مختلف دوروں سے گذر کر اور مختلف ہیئتیں بدل کر اس شکل تک پہنچی ہے جس کو آج قوم کہا جاتا ہے۔ جذبۂ قومی دراصل انسان کی اجتماعی جبلّت کا ایک نتیجہ ہے۔ تمدن کے ابتدائی دور ہی سے اپنی حفاظت کے لئے افراد کو مل جل کر رہنے کی ضرورت پیش آگئی تھی۔ مذہب ان کے اتحاد کا پہلا مرکز تھا۔ عبادت کے لئے جب وہ جمع ہوتے تھے تو اپنے کسی ممتاز شخص کی سرکردگی میں جمع ہوتے تھے۔ مورخین کا خیال ہے کہ جماعتی زندگی کی سب سے پہلی شکل یہی سرقبیلی جرگے (Patriarcal Tribes) تھے، جو ابتدا سے ہی اپنی مخصوص انفرادیت رکھتے تھے اور باہم اپنے اور غیر کا امتیاز کرتے تھے۔ یہی جرگے رفتہ رفتہ قبیلے بنے اور قبیلوں نے اپنی ریاستیں قائم کیں۔ ان ریاستوں کے حاکموں نے بسا اوقات کئی کئی قبائل کو متحد کر کے ان میں ایک ہی طرح پر زندگی گذارنے کا جذبہ پیدا کیا۔ اور ایک ہی زبان کو رائج کیا، اس طرح قبیلے قوم بنے قومی جذبہ نے اتحاد کی جو مادی شکل

اختیار کی وہ یہ تھی کہ ہر قوم اس کی خواہشمند ہوئی کہ اپنے لئے ایک آزاد سیاسی نظام قائم کرے۔ اس نظام کی سب سے پہلی شکل جس کا ہمیں علم ہے شہری ریاستیں تھیں۔ ریاستی نظام قائم کرنے کی خواہش کے ساتھ ہی ساتھ ان قوموں میں یہ خواہش بھی پیدا ہوئی کہ ہر ایک کے پاس اپنا اپنا ایک مخصوص قطعۂ زمین ہو جس کی حدود متعین ہوں۔ اس وطنی علاقہ میں ان کے سیاسی اداروں اور ان کے قومی رسم و رواج نے جڑ پکڑی اور ان کی روایات قائم ہوئیں۔

یہ قومی ریاستیں جوں جوں فتوحات کے ذریعہ سلطنتیں بنتی گئیں قوموں کا جذبہ قومی اور بڑھتا گیا، چونکہ قومیت کے ابھارنے میں فرمانروا کی ذات کو بڑا دخل تھا اس لئے وہی قومی جذبہ کا مرکز بنا۔ جوں جوں قومیں تدریجی ترقی کے منازل طے کرتی گئیں یہ مرکز فرمانروا کی ذات سے منتقل ہو کر مشترک قومی روایات، رسم و رواج اور مذہب کی طرف آگیا اور انھیں رابطوں کو معیار بنا کر قومیں اپنے اور غیر کا امتیاز کرنے لگیں۔

حضرت مسیح کے زمانے سے بہت پہلے دنیا میں قومیں موجود تھیں، مثلاً ایرانیوں کی قوم اپنا مخصوص کلچر، مذہب اور زبان رکھتی تھی، گو اس کا سیاسی نظام اتنا متحد اور مستحکم نہ تھا جتنا موجودہ اقوام کا ہے پھر بھی وہ اپنے اور دوسروں کے درمیان بہت سی مابہ الامتیاز خصوصیتیں رکھتی تھی، اسی طرح یہودی قوم اپنی مستقل ہستی رکھتی تھی اور اپنی قومی خصوصیات کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسری قوموں سے ممتاز سمجھتی تھی۔ یونانی قوم بھی اپنی تمدنی برتری کے زعم میں ہمیشہ باہر والوں پر فوقیت کا دعویٰ کرتی رہی غرض قومیت، تاریخ کے قدیم عہد میں بھی دنیا میں

موجود تھی، موجودہ دور کی قومیت اور اُس قومیت میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ محض ایک جذبہ تھی اور یہ اصول کی شکل اختیار کر کے عقیدہ بن گئی ہے۔

انقلابِ فرانس تک یورپ میں قومیت کی ترقی

عہدِ وسطیٰ سے قبل کا زمانہ قومیت کی ترقی کے لئے کچھ مساعد نہ تھا، یہاں تک کہ عہدِ وسطیٰ کے ابتدائی دور میں بھی ہمیں یورپ میں قومیت کا تصور مفقود نظر آتا ہے اس کی جگہ ایک ایسا معاشرتی نظام رائج تھا جس کی خصوصیت انتشار و پراگندگی تھی۔ لاتعداد چھوٹی چھوٹی حکومتیں اور ریاستیں قائم ہوگئی تھیں اور تمام قومیں اور نسلیں ایک دوسرے سے خلط ملط ہوگئی تھیں۔ کل یورپ میں جاگیردارانہ نظام قائم تھا اور جاگیرداروں کے آپس کے جھگڑوں اور جنگوں نے یورپ کے قومی اتحاد کو پاش پاش کر دیا تھا، مزید براں اس دور میں مسیحیت کی طاقت بھی قومیت کے نشوونما کو روکتی رہی، ایک طرف تو رومن کیتھولک گرجا قوم پرستی کی جگہ ایک وسیع انسانی نقطۂ نظر رائج کرنا چاہتا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ یورپ کو ایک گرجا کا پیرو بنا کر مذہبی اختلافات کو مٹا دے دوسری طرف مقدس رومی شہنشاہیت کے عالمگیر نظام نے بہت سی چھوٹی چھوٹی قوموں کو ایک مشترک اقتدار کا مطیع و فرمانبردار بنا کر قومی تعصبات کی شدت کو کم کر دیا تھا۔ مسیحی گرجا کے سردار یا پایائے روم کا روحانی اقتدار اور رومی شہنشاہ کا سیاسی اقتدار مسیحی دنیا کو متحد کئے ہوئے تھا، لیکن خود یہ دونوں طاقتیں دنیوی اقتدار اور مادّی ترقی کے لئے ایک دوسرے کی حریف تھیں۔ ان کے ظلم وستم اور ان کی عقلی اور علمی مخالفت کی وجہ سے اس نظام کا زیادہ عرصہ برقرار رہنا محال تھا،

علاوہ بریں ان دونوں کے قائم کئے ہوئے مصنوعی اتحاد کے خلاف برابر ردِ عمل جاری تھا، اور یورپ ان کی مسلط کی ہوئی یگانگت اور یکسانیت سے آزاد ہو کر اپنی سیاسی تشکیل کے لئے ایک مرتبہ پھر قومیت کے اصول کا خواہشمند تھا، جوں ہی یورپ میں نسلوں اور قوموں کی مہاجرت کا سلسلہ ختم ہوا اور یورپی ملکوں کی آبادی سکون کے ساتھ اپنے اپنے ملک میں قیام پذیر ہوئی قومیت کا دبا ہوا جذبہ پھر ابھر آیا اور جماعتیں آپس میں پھر ایک بار اشتراک و یکسانیت ڈھونڈھنے لگیں۔ اور اپنی زندگی کی تنظیم قومی بنیادوں پر کرنے لگیں۔

قومیت کا جو جذبہ اس وقت یورپی قوموں میں پیدا ہوا اس کا ایک سبب تو نسلی اور جغرافی حالات کی یکسانی تھی لیکن سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ہر قوم کو اپنی جگہ پر یہ یقین تھا کہ وہ اپنی جداگانہ سیاسی اور تمدنی ہستی رکھتی ہے اور ایسی انفرادی خصوصیات کی مالک ہے جو مدتوں میں اس کے اندر پیدا ہوئی ہیں، ایک طرف تو قوموں میں یہ جذبہ پیدا ہوا اور دوسری طرف عالمگیر گرجا کے اثر اور اقتدار کو علوم کے اس احیا نے جو چودھویں صدی سے سولھویں صدی تک یورپ میں جاری رہا اور مذہبی اصلاح کی اس کوشش نے جسے رفارمیشن کہا جاتا ہے، ختم کر دیا۔ مگر قومیں اس سے پہلے عہد وسطیٰ ہی میں وجود میں آ چکی تھیں۔

یورپ میں سب سے پہلے جو قوم وجود میں آئی وہ انگریز ہیں، گیارھویں صدی تک انگلستان کو بیرونی حملہ اور ان کی آمدورفت کی وجہ سے سکون نصیب نہ ہوا اور ملک قبائلی جنگوں کا شکار رہا۔ لیکن نارمنی اور انڑوی (Angle)

بادشاہوں کے عہد میں امن و امان قائم ہوگیا۔ اور تیرھویں صدی تک انگلستان ایک متحدہ قوم بن گیا۔ ایڈورڈ اول کے عہد تک قومی اتحاد کا جذبہ خوب ترقی کر چکا تھا۔ اور انگریزی قوم میں اپنی سیاسی تنظیم کی خواہش بھی پیدا ہوگئی تھی چنانچہ اُن کی قومی ریاست وجود میں آئی۔ اس قومی اور سیاسی اتحاد کا پہلا نتیجہ یہ تھا کہ انگریزی قوم نے اپنے ہمسایہ ملکوں پر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہا اور اپنے ملک سے باہر اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرنا شروع کردی۔ اس کوشش کے نتائج ویلس کی فتح، اسکاچستان (اسکاٹلینڈ) کی جنگ آزادی اور فرانس کی جنگ صد سالہ کی شکل میں دنیا کے سامنے آئے۔ اپنی آزادی کو قائم رکھنے کے لئے اسکاچستان کو جو جنگ کرنا پڑی اس کی وجہ سے اسکاچ قوم میں قومیت کا جذبہ استوار ہوا۔ اسی طرح پندرھویں صدی کے اوائل میں فرانس میں انگریزی حکومت کے قیام نے فرانسیسی قوم میں جو عام مخالفت کا جوش پیدا کیا اس نے فرانسیسی قومیت کو فروغ دیا۔ فرانس میں قومیت کے جذبات جس انتہا کو پہنچے اس کی مثال ہمیں جون آف آرک کی شخصیت میں ملتی ہے۔

اسکاچ، انگریز اور فرانسیسی دنیا کی پہلی تین قومیں ہیں جنھوں نے قومیت کے جذبے سے معمور ہو کر قرونِ وسطیٰ ہی میں اپنی قومی ریاستیں قائم کرلیں، لیکن قومیت کو پورا پورا فروغ قرونِ وسطیٰ کے اخیر میں حاصل ہوا۔ اب تک قومی ریاستیں اپنی ابتدائی حالت میں تھیں۔ وہ اپنی جغرافی حد بندی کر چکی تھیں۔ اور قومی اتحاد کا جذبہ اِن کے اندر پیدا ہوچکا تھا، اسی جذبۂ اتحاد نے رفتہ رفتہ قوم پرستی کی شکل اختیار کرلی۔

چودھویں پندرھویں اور سولھویں صدیوں کا زمانہ یورپ میں علوم کے اُحیار کا زمانہ تھا، اس دور میں ملکوں نے اپنے اپنے قدیم ادب کو زندہ کیا۔ ملکی زبانیں اور قومی کلچر جو قرونِ وسطیٰ کی تاریکیوں میں ماند پڑ چکے تھے پھر ترقی کرنے لگے۔ ہر ملک میں ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جو اپنی قوم کی ذہنی تربیت کر سکیں۔ علمی اور ذہنی ترقی کے ساتھ قومیت کا جذبہ بھی ترقی کرتا گیا۔ اس جذبہ کو سب سے زیادہ جس چیز نے اُبھارا وہ اُس دور کے فلسفیوں کا یہ خیال تھا کہ ہر وہ جماعت جو اپنی قومی خصوصیات رکھتی ہو اس بات کی مستحق ہے کہ وہ اپنی ریاست بھی رکھتی ہو، اسی زمانہ میں یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہوا جس نے یورپی قوموں میں دولت پیدا کرنے کی خواہش کو بہت بڑھا دیا اور وہ اپنی تجارت کو ترقی دینے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہوگئیں، بڑے بڑے جہازی بیڑے تیار کئے گئے اور دوسرے ملکوں کے راستے معلوم کرنے کے لئے بھیجے گئے، نئے ملک معلوم کرنے والے قومی ہیرو کہلائے اور ان کے معلوم کئے ہوئے ملکوں میں جو تجارت کی گئی وہ قومی تجارت کے نام سے پکاری گئی۔

جس طرح تحریک احیار جسے نشاۃ ثانیہ بھی کہتے ہیں قومی کلچر کے پیدا کرنے کا باعث ہوئی تھی اسی طرح تحریک رفارمیشن قومی تہذیب پیدا کرنے کا سبب بنی۔ مذہبی اصلاح کے علمبرداروں نے اپنی اپنی قوموں کو عالمگیر مسیحی گرجا سے جُدا ہو جانے کی تعلیم دی، فرانس میں کالون (Calvin) اور جرمنی میں لوتھر کی اصلاحی کوششیں اپنی اپنی قوم کے لئے تھیں اور قومی رنگ رکھتی تھیں، رفتہ رفتہ جب تحریک رفارمیشن یورپ کی عام تحریک بن گئی تو یورپ

کی ہر قوم اس تحریک کو قومی نقطۂ نظر ہی سے دیکھنے لگی'

ان تمام اثرات کے ماتحت سولھویں صدی میں یورپ کی اکثر قوموں میں قومیت کا جذبہ اپنے پورے نشو و نما کو پہنچ گیا۔ انگلستان' اسکاچستان اور فرانس تو عہد وسطیٰ ہی میں قومیں بن چکے تھے اب دور حاضرہ کی ابتداء میں دو قومیں اسپینی اور پرتگالی او ر وجود میں آئیں۔ ان ملکوں میں صلیبی جنگوں نے قومیت کے جذبات پیدا کئے' ان جذبات کو ترقی دینے کا باعث وہ شخصی حکمران تھے جو ان قوموں میں قومی افتخار کا جذبہ پیدا کرتے رہے اور ان کو بیرونی فتوحات کے لئے آمادہ کرتے رہے۔ یورپ کی سیاست کے بدلئے اسپین اور فرانس کے درمیان مقابلہ شروع ہوا' اسپین کی قوت فرانس کے مقابلہ میں زیادہ تھی اس وجہ سے اسپین سو سال تک یہ دعویٰ کرتا رہا کہ صرف اسپینی تہذیب ہی کو یورپ کے ملکوں میں جاری ہونا چاہئے۔

جس طرح فرانس میں انگلستان کی حکومت کا قیام فرانسیسی قومیت کے ابھرنے کا باعث ہوا تھا اسی طرح ہالینڈ میں اسپین کی حکومت کی وجہ سے قومیت رونما ہوئی یہ ملک اسپینی قلمرو میں شامل تھا' مگر بیرونی دشمن سے نفرت کے جذبہ نے اسے بھی آزاد ریاست بنا دیا اور اس طرح قومی ریاستوں میں ایک ریاست کا اور اضافہ ہوا۔

سولھویں صدی میں دو اور قومی ریاستیں پیدا ہوئیں یعنی سوئیڈن اور ڈنمارک۔ سوئیڈن کا بھی وہی نصب العین تھا جو دوسری قومی ریاستوں کا تھا۔ چنانچہ قومی عظمت کا سکہ جمانے کے لئے اس نے بھی بیرونی فتوحات پہ

کمر باندھی، اور جرمنی، روس اور پولستان کے وہ علاقے جو بحیرہ بالٹک کے آس پاس واقع ہیں فتح کرلئے، یہ تینوں قومیں ابھی تک اپنی ملی تنظیم نہ کرپائی تھیں لیکن سوئیڈن کی دست درازیوں نے ان میں بھی قومیت کا جذبہ پیدا کردیا۔ سب سے پہلے روس اپنی تنظیم پر آمادہ ہوا۔ چنانچہ سترھویں صدی کے اواخر میں پیٹر اعظم کی کوششوں نے روس میں قومی اتحاد کی داغ بیل ڈالی، اسی زمانے میں جب ترکوں نے روسیوں کے لئے بحیرۂ اسود کا دروازہ بند کیا تو روسی قومیت کو اور بھی تقویت پہنچی، یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی کے شروع ہی میں روس جیسا وسیع اور غیر منظم ملک بھی ایک متحدہ قوم بن گیا۔ سترھویں صدی کے ختم تک یورپ کے تمام مغربی شمالی اور مشرقی ملکوں میں قومیت کا پورا پورا نشوونما ہوچکا تھا، اور ان سب نے قومی اصولوں پر اپنی سیاسی تنظیم بھی کرلی تھی، لیکن وسط یورپ اور جنوب مشرق کے علاقے میں ابھی تک قومیت پیدا نہ ہوئی تھی، یورپ کے یہ حصے جرمنی، اطالیہ، آسٹریا ہنگری کی سلطنت، سلطنت عثمانیہ، پولستان اور جزیرہ نما بلقان وغیرہ پر مشتمل تھے۔ ان میں سے آسٹروی اور ترکی سلطنتوں کو چھوڑ کر باقی تمام ملک بہت سی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں اور ریاستوں میں منقسم تھے۔ صرف اطالیہ میں اس وقت نو ریاستیں تھیں اور جرمنی میں تو تین سو سے زیادہ ریاستیں موجود تھیں۔

یہ تمام غیر منظم علاقے قومی ریاستوں کی ہوس کا نشانہ بنے اور اٹھارھویں صدی میں یورپی جنگوں کا مرکز بنے رہے۔ ان میں سے سب سے پہلے

جس ملک میں قومیت پیدا ہوئی وہ پولستان تھا۔ اس کا سبب بھی قومی ریاستو کی چیرہ دستی تھی۔ پروشیا، روس اور آسٹریا نے ۱۷۷۲ء میں پولستان کو فتح کر کے آپس میں تقسیم کر لیا۔ بیرونی طاقتوں کی اس فتح نے پول قوم کے اندر قومیت کا جذبہ پیدا کیا اور انھوں نے بھی اپنی بچی بچائی سلطنت کی تنظیم قومی ریاست کے اصول پر کر لی۔

اٹھارھویں صدی کے انقلاب فرانس سے قومیت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ اس انقلاب نے قومیت کے اصول کو معاشرتی تنظیم کی بنیاد قرار دے کر افراد قوم کو حکومت کے اختیارات کا مستحق قرار دیا۔ اس اصول نے یورپ میں فرمانروائی کا سارا اصول ہی بدل دیا۔ اب تک فرمانروا کے اختیارات میں قوم کو کوئی دخل نہ تھا لیکن انقلاب فرانس نے عوام کو قوم کی شکل میں سیاست کا مختار بنایا اور حکمراں کے انتخاب کا حق اُن کو تفویض کیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انقلاب کے علمبرداروں نے نسلی امتیازات کو بہت اہمیت دی اور وطنیت کے جذبہ کو حد سے زیادہ اُبھارا۔ فوجی تعلیم کا نظام قائم کیا گیا۔ قومی اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ قومی وفاداری کی تعلیم دی گئی۔ فرانسیسی علوم و فنون کو قومی رنگ دیا گیا۔ قومی ترانے اور قومی جھنڈے نے پہلی بار فرانس میں رواج پایا۔ غرض فرانس کی زندگی میں ہر اُس چیز کو داخل کر کے جس سے قومیت کے جذبہ کو ترقی ہو فرانسیسیو کو جمہوریت کے واحد نظام کے ماتحت مجتمع کر دیا گیا۔

جمہوریت کا اعلان گویا قومیت کو تسلیم کر لینے کا اعلان تھا۔ انقلاب

فرانس کے علمبرداروں نے اگرچہ خود قومیت کی تبلیغ نہ کی لیکن انقلاب کے اثرات فرانس ہی تک محدود نہ رہے، دوسرے ممالک بھی جمہوریت کے خیالات سے متاثر ہوئے اور یہ انقلاب ہی کا اثر تھا کہ قومیت انیسویں صدی کی نمایاں خصوصیت بن گئی۔

نپولین کے عہد نے یورپ میں قومیت کے جذبات کو عام کر دیا۔ اگرچہ ذاتی اغراض کے مقابلہ میں اس نے اسپین، پرتگال، اور ہالینڈ کے قومی جذبہ کو بے دردی سے پامال کیا لیکن دورِ جدید کے مدبروں میں وہ پہلا شخص ہے جس نے قومیت کے جذبہ کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ اس نے پولستان میں "گرانڈ ڈچی آف وارسا" قائم کر کے پول قوم کو اپنی قومی تنظیم کا موقع دیا۔ اسی طرح اطالیہ کے ایک حصے میں نیپلس کی سلطنت قائم کرائی اور ایک دوسرے حصہ کو قدیم اطالوی سلطنت ہی کے نام سے منظم کرایا۔ یہ ضرور ہے کہ ان ملکوں میں وطنیت کے جذبہ کو ابھار کر وہ اپنے مقاصد میں ان کو اپنا ہمدرد بنانا چاہتا تھا لیکن ان کوششوں سے قومیت کے جذبہ کو جو تقویت پہنچی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نپولین کے عہد نے قرونِ وسطیٰ کی پرانی بساط کو اٹھا کر اور پرانے اداروں کو مٹا کر یورپ کی آئندہ قومی تنظیم کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ اس کے قائم کئے ہوئے اصولوں نے یورپ میں معاشرتی آزادی عام کر دی۔ نپولین کے ہاتھوں جاگیرداری کے نظام کی بربادی گو دنیا کے لئے پیامِ مساوات تھی۔ نپولین کے بنائے ہوئے وہ قوانین جو اس نے اپنے مفتوحہ ممالک میں جاری کئے نسبتاً بہت زیادہ قرینِ عقل اور واضح تھے اور انھوں نے

بڑے اور چھوٹے سب کو برابر کر دیا۔ گو اس کے قائم کئے ہوئے اصول قومی جذبہ کی ترقی میں بہت ممد ہوئے مگر اس کا طریق کار قومیت کے لئے بہت مضر ثابت ہو رہا تھا، اس کی یہ کوشش کہ وہ تمام یورپ کو فرانس کی قلمرو میں شامل کرے یورپ کی سیاسی آزادی کے لئے حد درجہ خطرناک تھی، مزید براں نپولین کی ساری کامیابی عسکری قوت کے بل بوتے پر تھی اس لئے اُسے رعایا کی رضا و رغبت حاصل کرنے کی پرواہ نہ تھی۔ خیال اور رائے کی آزادی کا وہ قائل نہ تھا۔ پریس پر اُس نے پابندیاں عائد کردی تھیں، تعلیم یافتہ طبقہ کے خیالات کی پورے طور پر نگرانی کی جاتی تھی، اور مدرسوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم پر پورے طور پر نظر رکھی جاتی تھی۔ رائے عامہ پر اتنی پابندیاں آزادی کے منافی تھیں اور قومیت کے جذبہ کو نقصان پہنچا رہی تھیں۔ اسی کا ردّعمل تھا کہ وہی قومیت جس کو نپولین کی ذات سے اس قدر عروج حاصل ہوا تھا خود نپولین ہی کی تباہی کے لئے اُس کی حریف بن کر مقابل ہوئی۔

ابتدا میں اطالیہ اور جرمنی نے نپولین کا خیر مقدم کیا لیکن بعد میں فرانسیسی تسلط کے خلاف جو ردّعمل ہوا اس نے نپولین کی سلطنت کو قومیت کی چٹان پر پاش پاش کر دیا۔ قومی ریاستوں میں برطانوی ریاست سب سے پرانی تھی۔ جس وقت سارا یورپ نپولین کے سامنے جھکا ہوا تھا، برطانیہ اس کا حریف بن کر میدان میں آیا۔ اور بائیس سال تک مقابلہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دوسرے ممالک میں بھی قومی جذبہ مشتعل ہوا اور وہ بھی نپولین کے خلاف آمادۂ بغاوت ہو گئے، اسپین نے چھ سال تک نپولین کا مقابلہ کیا۔ آسٹریلیا اور پروشیا بھی

مقابلہ میں آئے، لیکن آخر میں روس کے ساتھ ۱۸۱۲ء کی جنگ نے نپولین کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔

نپولین کی فتوحات نے یورپ کے سیاسی توازن کو بگاڑ دیا تھا، اس کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے ۱۸۱۵ء میں وینا کی کانگریس منعقد ہوئی، عام توقعات یہ تھیں کہ اب سلطنتوں کی تقسیم قومیت کے اصول پر کی جائے گی کیونکہ نپولین کی شکست دراصل قومیت کی فتح تھی۔ مگر وینا کی کانگریس کے مدبر جن میں زیادہ تر ایسے تھے جو ملوکیت ہی کے نظام کو حکمرانی کی واحد ممکن صورت سمجھتے تھے قومی توقعات کو پورا نہ کر سکے، انھوں نے ملکوں کی جدید تقسیم میں قومیت کے جذبہ کو نظر انداز کر دیا جس کی وجہ سے بہت سی قومیں مطمئن نہ ہوئیں جو قومیں پہلے سے متحد تھیں اُن کو ہاتھ نہ لگایا گیا، صرف ان ملکوں کو تقسیم کیا گیا جن میں قومیت نئی نئی پیدا ہوئی تھی اور جن کی قومیت کو نظر انداز کرنا یورپ کے امن کے لئے کسی حالت میں مفید نہیں ہو سکتا تھا۔ پولستان کی "گرانڈ ڈچی آف وارسا" کو روس کے زیرنگیں کیا گیا اور پولستان کے دو بڑے بڑے علاقے پوزن اور گلیشیا، پروشیا اور اسٹریا کو دے گئے۔ بلجیم کو ہالینڈ کے ساتھ ملا دیا گیا۔ اطالیہ کا شمالی حصہ اسٹریا کی سلطنت میں شامل کر دیا گیا۔ اور باقی حصہ کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور جرمنی کو ۳۹ ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

مدبرین یورپ کا خیال تھا کہ اس تقسیم کی وجہ سے یورپ میں امن وامان قائم ہو جائے گا مگر نتیجہ اس کے برعکس ہوا، انیسویں صدی کی تمام جنگیں محض اس تقسیم کی وجہ سے وجود میں آئیں۔

انیسویں صدی میں قومیت کی ترقی

ویئینا کی کانگریس کے وقت یورپی ملکوں کی جو تقسیم کی گئی اُسے قومیت کی تاریخ میں ایک دور آفریں واقعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اب تک قومی ریاستوں کے وجود میں آنے کا باعث مخصوص حالات اور واقعات تھے لیکن اس وقت سے قومیت نے ایک سیاسی عقیدے کی حیثیت اختیار کرلی، اور یورپ میں نہایت شد و مد کے ساتھ اس عقیدے کی تبلیغ ہونے لگی، ہر قوم کا یہ حق قرار دیا گیا کہ وہ اپنی قومی زندگی کی تنظیم اُن اصولوں پر کرے جو اس کی بقاء کے لئے ضروری ہیں۔ اگر وہ چاہے تو اپنی قومی ریاست بھی قائم کرسکتی ہے۔ انیسویں صدی کی سیاست میں قومیت کے مسئلہ کو جس چیز نے سب سے زیادہ اہمیت دی وہ یہی "حق خود اختیاری" کا عقیدہ تھا۔

اس دور میں قوموں میں عام طور پر یہی خواہش پیدا ہوگئی کہ ان کی قومیت کو تسلیم کیا جائے اور ان کو اپنی ریاست قائم کرنے کا حق دیا جائے۔ جرمنی، اطالیہ، بوہیمیا اور پولستان کی بغاوتیں آزادی کے اسی مطالبے کا نتیجہ تھیں۔ یورپ کا صنعتی انقلاب بھی اس دور میں قومیت کے لئے تقویت کا باعث ہوا، ذرائع آمد و رفت اور وسائل خبر رسانی میں جو سہولتیں انیسویں صدی میں پیدا ہوئیں ان کی وجہ سے ہر ملک کے افراد آپس میں ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب ہوگئے اور ملکی اخبار گوشے گوشے میں قومیت کا راگ گانے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ملک کے باشندے اپنے مشترک قومی اغراض و مقاصد کو ایک ہی طرح پر محسوس کرنے لگے۔

اسی زمانہ میں یورپ میں انشار کا وہ طرز رائج ہوا جس کو رومانی طرز کہتے ہیں، اور جس نے قوموں میں اپنی قدیم روایات کو زندہ کرنے کا شوق پیدا کر دیا۔ رومانیت کی وجہ سے ملکی و تاریخ ادب میں ایک خاص قومی رنگ پیدا ہو گیا۔ اس وجہ سے اس طرز کو ملکوں میں عام مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ یونان، رومانیہ، اطالیہ، جرمنی، سربیا وغیرہ میں قومی جذبات نئے نئے پیدا ہوئے تھے، اس لئے ان ملکوں کی قومیت کو اس طرز انشار نے بہت تقویت پہنچائی۔ ان تمام موثرات کے ماتحت یورپ کے سیاسی مفکرین نے قومیت کے متعلق آخری فیصلہ یہی کیا کہ ہر قوم کے دعویٰ قومیت کو تسلیم کیا جائے، اور اسی حق خود اختیاری دیا جائے، چنانچہ انیسویں صدی کے آخری نصف حصے میں جرمن اور اطالوی قومیں وجود میں آئیں۔ یونان آزاد ہوا، ہنگری اور سورکستان نے اپنی قومیت کی اور بلقان کی مختلف قوموں نے اپنی اپنی تنظیم کی۔

جرمنی

اٹھارھویں صدی کے اختتام تک موجودہ جرمنی تین سو ریاستوں میں منقسم تھا۔ اس سیاسی انتشار کے باوجود جرمن قوم میں چند ایسی خصوصیات موجود تھیں جن کی وجہ سے اُن میں متحدہ قومیت کا احساس پیدا ہو سکا۔ نسلیت کا احساس ان میں ہمیشہ سے موجود تھا۔ باوجود اپنی سیاسی فرقہ بندی کے وہ اپنی تمام جماعتوں کو نسلی قرابت کے رشتہ میں منسلک سمجھتے تھے، ان کی معاشرتی زندگی میں بہت کچھ یکسانیت تھی، اپنے اسلاف کے کارناموں پر افتخار کا جذبہ اُن میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ پاپائیت کے خلاف لوتھر کی مخالفت ان سب کے لئے باعث افتخار تھی، انھیں تمام عناصر نے

اُن میں قومیت کا احساس پیدا کیا لیکن اس احساس کو سب سے زیادہ تقویت پہنچانے کا باعث وہ جنگیں ہوئیں جن میں نپولین نے جرمنی کی ریاستوں کو فتح کیا۔ ان جنگوں نے جرمن قوم میں وطنیت کی ایک نئی روح پیدا کر دی اور غیر ملکی تسلط کے خلاف ان کی تمام جماعتیں متحد ہو گئیں، شلر اور فشٹے جیسے جرمن مفکر جو اب تک آفاقیت کی تعلیم دیتے رہے تھے اور قومی تعصبات سے الگ ہو کر تمام دنیا کو اپنا وطن سمجھتے رہے تھے جرمن قومیت کی تعلیم دینے لگے۔ یہ فشٹے ہی کی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ جرمنی میں ہیگل نے قومیت کا وہ نظریہ پیش کیا جس نے ریاست کے ساتھ جرمن قوم کی وابستگی کو پرستش کی حد تک پہنچا دیا۔

جرمن یونیورسٹیوں کے استادوں اور طالب علموں نے قومی آزادی کے لئے جس جوش و خروش کا اظہار کیا اس سے جرمنی میں قومی اتحاد کا پیدا ہو جانا یقینی تھا، جرمن قوم نے نہ صرف بیرونی تسلط کے خلاف اعلان جنگ کیا بلکہ اپنے اندرونی سیاسی انتشار کو بھی دور کیا اور جرمنی کو ایک متحدہ ریاست بنا دیا۔ اس کام کے لئے جرمن کا مشہور سیاست داں بسمارک جس کو جرمن قومیت کا بانی کہا جاتا ہے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس نے ۱۸۶۶ء میں جرمنی میں آسٹریا کے اقتدار کو ختم کر کے جرمنی کے لئے آزادی کا راستہ کھول دیا۔ اور فرانس کے خلاف اعلان جنگ کر کے جرمن قوم کے وطنی جذبہ کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ اسی کی ترغیب پر جرمن یونیورسٹیوں کے استادوں نے قومیت کی تعلیم دی جو متحدہ قومیت پیدا کرنے کا سب سے بڑا سبب ہوئی، جرمن یونیورسٹیوں سے جو قومیت کی

صدا اٹھی وہ تمامتر نسلی افتخار کے جذبہ پر مبنی تھی۔ ۱۸۵۹ء میں جرمن فلسفی ترائٹسکے نے جرمن نسل کو تمام دوسری نسلوں سے برتر قرار دے کر اُسے اس بات کا مستحق ٹھہرایا کہ وہ اپنی تہذیب کو اُن تمام قوموں میں پھیلائے جو اُن حدود میں رہتی ہوں جنھیں جرمنی اپنی قدرتی حدود سمجھے۔ اس نظریہ نے جرجنگ جویانہ اور جارحانہ قوم پرستی پیدا کی۔ اس کی عملی مثال ہم آج جرمنی کے رہنما ہٹلر کے طریق کار میں دیکھ رہے ہیں۔

اطالیہ انیسویں صدی کے وسط میں اطالیہ، پولستان، ہنگری اور جرمنی میں جو قومی بغاوتیں ہوئی تھیں اُن میں بہت سے لوگ جلا وطن کئے گئے تھے، ان جلا وطنوں نے قومیت کی تحریک کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ پیرس، لندن، سوئسٹان، اور بلجیم ان جلا وطنوں کے مرکز بنے تھے۔ یہیں سے اُنھوں نے قومیت کی تبلیغ شروع کی۔ ان میں اطالیہ کے جلاوطن میزنی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وطن کی تباہ حالی پر اس کا دل بے چین تھا، چنانچہ ۱۸۳۱ء میں "جوان اطالیہ" کے نام سے اُس نے ایک جماعت قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ اطالیہ کے باشندوں کے ہر طبقہ اور جماعت میں قومیت کا احساس پیدا کرے۔ میزنی کے رفقاء اپنے مقصد کے حصول کے لئے جان کی بازی لگا کر میدان میں آئے۔ اور انھوں نے اطالیہ کے کسانوں، مزدوروں، چرواہوں اور پیشہ وروں کو اُن کے باعظمت ماضی کی روایات یاد دلا کر ایک نئے جوش سے بھر دیا۔ میزنی اور اس کے ہمعصر دوسرے جلا وطنوں نے صرف اپنے ہی ملک کی آزادی کے لئے کوشش نہیں کی بلکہ وہ

اس کے بھی خواہشمند تھے کہ ہر اس قوم کو جو قومیت کے لئے اپنا حق ثابت کر سکے آزادی حاصل کرائی جائے۔

میزنی کی قومیت ملکی اور وطنی تنگ نظری سے آزاد تھی۔ چونکہ اس میں داخلی اور روحانیت تھی اس لئے اس کے تصور میں قومیت ایک پاک جذبہ تھی، اور اس جذبہ کو وہ انسانی فلاح و ترقی کا ذریعہ سمجھتا تھا، وہ قوموں کو آپس میں ایک دوسرے کا ہمدرد بنانا چاہتا تھا، اس کے نزدیک قومی مقاصد کا عام انسانی مقاصد سے ہم آہنگ ہونا ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اطالیہ کی قومیت دوسری قوموں کی نگاہوں میں ذرا نہ کھٹکی۔ میزنی کا قائم کیا ہوا تصور بہت کم عرصے کے لئے یورپ میں قدم جما سکا۔ بعد کی قومیت کا تصور سراسر قوموں کی معاندانہ کشاکش اور حریصانہ رقابت پر مبنی تھا اس وجہ سے میزنی کے تصور سے بالکل جدا تھا۔ میزنی سے قبل دانتے جس نے اطالیہ کے ادب میں قومی رنگ پیدا کیا تھا احساس کو بیدار کرنے کی کوشش کر چکا تھا، اسی طرح میکیاولی بھی اطالوی ریاستوں کو فرمانروا کی اطاعت کی تعلیم دے کر قومیت کے جذبہ کو ابھارنے میں مدد دے چکا تھا، لیکن اطالوی قومیت کا آغاز میزنی ہی کی تعلیم سے ہوا۔

میزنی اور اس کے رفقار کار گیری بالڈی اور کیور کی متحدہ کوششوں کی وجہ سے اطالیہ کا قومی انتشار بالآخر ختم ہوا۔ اطالوی ریاستیں آسٹریا کے اقتدار کو ختم کرنے کے لئے متحد ہوگئیں۔ اور ان میں سے اکثر نے سنہ ۱۸۶۰ء میں شاہ ایمانوئل کو اپنا پہلا بادشاہ بنالیا۔

جزیرہ نما بلقان کی ریاستیں | جزیرہ نما بلقان کی ریاستیں چودھویں

صدی میں ترکوں کے قبضے میں آئیں، اٹھارھویں صدی میں ترکی حکومت سے آزاد ہونے کی خواہش ان کے اندر پیدا ہوئی اور یہی خواہش ان میں جذبۂ قومیت کی محرک ہوئی۔

یہ ریاستیں آپس میں ایک دوسرے سے بہت مشابہت رکھتی ہیں۔ سب کوئی نہ کوئی سلافی زبان بولتی ہیں مگر اس کے باوجود ہر ریاست اپنی اپنی جداگانہ معاشرت بھی رکھتی ہے، وطنیت کا جذبہ بھی ان میں حد سے زیادہ ہے۔ ترکوں کے قبضہ میں آنے سے پہلے یہ صدیوں تک باہم جنگ و جدال میں مصروف رہیں۔ ان جنگوں نے انھیں ماضی کی روایات کا سرمایہ بہم پہنچایا، اور یہ روایات اس وقت کام آئیں جب انھوں نے ترکوں کے خلاف سر اٹھایا۔ آسٹریا اور روس نے ان ریاستوں کو ترکوں کے خلاف مدد دی۔ اٹھارھویں صدی تک بلقان کی قوموں نے یورپ کی سیاست میں کوئی حصہ نہ لیا تھا، لیکن انیسویں صدی میں قومیت کا سیلاب ان کو بھی بہالے گیا، چنانچہ انھوں نے یکے بعد دیگرے ترکوں کے خلاف بغاوتیں شروع کردیں۔ سب سے پہلے ۱۸۰۴ء میں سربیا نے کراجارج کے زیر علم بغاوت کی، اس کے بعد ولیشیا اور مالدیویا کی ریاستیں میدان میں آئیں اور پھر یونان مقابلہ میں آیا، یہ ریاستیں یکے بعد دیگرے اسی طرح آزاد بھی ہوتی گئیں اور اپنی سلطنتیں قائم کرتی گئیں، ولیشیا اور مالدیویا نے رومانیہ کے نام سے اپنی آزاد ریاست قائم کی۔ بلغاریہ نے بھی ۱۸۷۵ء میں ترکوں کا سیاسی اقتدار ختم کرنے کے لئے علم بغاوت بلند کیا اور روس اور ترکی کی جنگ کے بعد

صلحنامہ برلن کی رو سے اس کو بھی حکومت خود اختیاری مل گئی، غرض انیسویں صدی کے اختتام تک بلقان کی یہ چاروں ریاستیں ترکوں سے آزاد ہوگئیں۔

ترک انیسویں صدی میں یورپ کی سیاسی فضا ترکوں کے بہت خلاف تھی، صدیوں سے تمام یورپ اس کا خواہاں تھا کہ ترکی سلطنت کو مٹا دے، روس ترکی کا سب سے بڑا دشمن تھا اور اسی کی ترغیب پر بلقان کی ریاستوں نے ترکی کے خلاف بغاوتیں کیں اور ترکی حکومت سے آزاد ہوئیں یورپ کی تمام دوسری سلطنتیں بھی ان بغاوتوں میں بلقان کی ریاستوں کا ساتھ دے رہی تھیں، ترکی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی جارہی تھی اور ترکی قوم کی حالت اس درجہ نازک ہو چکی تھی کہ یورپ کی قوتیں ترکوں کو "یورپ کا مرد بیمار" کہتی تھیں، ان حالات میں ترکی نوجوانوں میں قومی احساس کا پیدا ہونا کچھ خلاف توقع نہ تھا۔ ترکی بھی یورپ کا ایک حصہ ہے اور یورپ میں قومیت جس انتہا کو پہنچ چکی تھی، اس کی مثالیں ترکوں کے سامنے تھیں۔ بلقان کی ہمسایہ قوموں کی مثال سب سے زیادہ سبق آموز تھی، چنانچہ ترکی میں بھی ایک جماعت پیدا ہوئی جو "جوان ترک" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اب تک ترک قوم خلیفہ کے زیر نگیں تھی، اور ترکی کی حکومت شخصی تھی، جوان ترک اس طرز حکومت کو قومیت کے منافی سمجھتے تھے، اور جمہوریت کے خواہاں تھے، چنانچہ انھوں نے حکومت کی مخالفت شروع کی۔ رفتہ رفتہ اس مخالف جماعت کو ملک میں کامیابی حاصل ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۸ء

tutional

میں ترکی میں وہ انقلاب ہوا جو "جوان ترکوں کے انقلاب" کے نام سے مشہور ہے، اس وقت سے ترکی حکومت دستوری قرار دی گئی، قومیت کے جذبات روز افزوں ترقی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ترکی میں ایک اور انقلاب وجود میں آیا، جس کے بانی مصطفےٰ کمال تھے، ترکوں نے ۱۹۲۳ء میں خلافت کا خاتمہ کیا، اور ترکی جمہوریت کا اعلان کیا، اس انقلاب نے ترکوں کی زندگی کے ہر شعبے کو قومی رنگ میں رنگ دیا، ترکی زبان و ادب کو خاص منزلت دی گئی، رسم و رواج معاشرت و معیشت کو قومی سانچے میں ڈھالنے کی تدبیریں کی گئیں۔ زبان سے غیر ترکی الفاظ اور محاورے نکالنے کی فکر ہوئی، زبان کے پرانے الفاظ اور محاورے سختی کے ساتھ اٹھا دیے گئے، ملک میں قومی تعلیم کا نظام رائج کیا گیا، اور قومی ترقی کو حکومت کا واحد مقصد قرار دیا گیا۔

پول پولستان کے تین طرف یورپ کی تین طاقتور سلطنتیں آسٹریا، پروشیا اور روس واقع تھیں۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ ان تینوں سلطنتوں کی ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ پولستان کو سیاسی آزادی سے محروم رکھیں اور ایک قوم نہ بننے دیں، اس سلسلہ میں ہمسایہ طاقتوں کی کوششیں جس قدر زیادہ بڑھیں پولستان میں قومیت کے جذبہ کو اتنا ہی زیادہ فروغ ہوا۔ ۱۷۷۲ء سے یورپ کی جنگ عظیم تک پول قوم کو سیاسی آزادی نصیب نہ ہوئی اور وہ تین ایسی غیر قوموں کے درمیان منقسم رہی جو تہذیب میں اس سے بالکل مختلف تھیں، پھر بھی اس کی اپنی قومی خصوصیات برقرار رہیں اور محکومیت کے

مصائب قومی جذبہ کو برابر ترقی دیتے رہے۔ جنگ عظیم کے بعد پولستان کو ایک آزاد ریاست بنا دیا گیا لیکن ۱۹۳۹ء میں پھر جرمنی اور روس نے اس کو فتح کر لیا، اور آپس میں بانٹ لیا۔ پولستان کی قومیت کے لئے یہ ایک اور دعوت آزمائش ہے۔ قوت و جبر پول ریاست کو منتشر کرنے میں پہلے بھی کامیاب ہو چکے تھے، اس مرتبہ بھی انھیں کامیابی ہوئی ہے۔ مگر جیسے پہلے قومی جذبہ کو مٹانے میں انھیں ناکامی ہوئی کیا اس دفعہ بھی ایسا ہی نہ ہوگا؟ انسان کے جذبات و احساسات اکثر اس کے خارجی اداروں سے زیادہ پائدار ثابت ہوئے ہیں۔

اسپینی تاریخ کے دور جدید میں اسپین کے تمدن اور تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسپینی قومیت بھی نشو و نما پاتی رہی، رومی گرجا کے ساتھ ان کی عقیدت اور اسپین کے حکمرانوں کے ساتھ ان کی وابستگی ایسے عناصر تھے جو اسپینیوں کو من حیث القوم متحد کئے رہے، باسک قوم کو مستثنیٰ کر کے اسپین کی ساری آبادی رفتہ رفتہ متحد ہو گئی، اپنے اسلاف کے کارنامے اور نئی دنیا کی فتح میں ان کی دلیری اور ہمت اسپینی قوم میں قومیت کا احساس پیدا کرنے کے لئے کافی تھے، اس احساس کو ابھارنے کا سب سے بڑا سبب نپولین کی وہ جنگیں تھیں جو انقلاب فرانس کے زمانے میں اس نے اسپین فتح کرنے کے لئے لڑیں، ان جنگوں نے اسپین میں قومیت کی جڑوں کو ہمیشہ کے لئے مضبوط کر دیا۔

سوئس جدید قومیت کی تاریخ میں سوئس قوم یورپ کی تمام دوسری

قوموں سے مختلف ہے ان کی قومیت کا باعث ان کا مشترک سیاسی نظام ہے، زبان ومعاشرت کے لحاظ سے سوستان کی آبادی کے تین حصے کئے جا سکتے ہیں۔ ایک حصہ فرانسیسی زبان بولتا ہے اور فرانسیسی تمدن رکھتا ہے، دوسرا حصہ جرمن زبان اور جرمن تمدن اختیار کئے ہوئے ہے، اور تیسرے میں اطالوی زبان اور تہذیب رائج ہے، لیکن ان تینوں حصوں نے اپنی متحدہ ریاست قائم کرلی اور اپنی سیاسی وحدت کی بناء پر متحدہ قوم بن گئے، وطن کے ساتھ ان کی دلچسپی بڑھتی گئی، یہاں تک کہ وطن کے مناظر کے ساتھ ان کی محبت پرستش کی حد تک پہنچ گئی۔ اپنے ماضی کی تاریخی اہمیت کا احساس ان کے دلوں میں بھی پیدا ہوگیا اور اپنے مخصوص سیاسی اداروں پر بھی فخر کرنے لگے، ان تمام باتوں نے قومیت کے اُن عناصر کی کمی کو بڑی حد تک پورا کردیا جن سے یورپ کی دوسری قومیں بنی ہیں۔

روسی

جنگ عظیم سے قبل روسی قوم متعدد قوموں پر مشتمل تھی، جو ایک ہی نظام کے ماتحت تھیں اور مشترک فرماں روا کی اطاعت کرتی تھیں، ان سب کے لئے ضروری تھا کہ روسی زبان بولیں، اور اپنے یہاں مشترک تعلیم رائج کریں جن سے روسی تہذیب پیدا ہوسکے۔ زار خاندان کے فرمانرواؤں کی انتہائی کوششوں کے باوجود یہ قومیں روسی قوم میں ضم نہ ہوئیں، جب تک زار کی سلطنت غالب رہی یہ قومیں اس کے قانون کی گرفت میں بندھی رہیں۔ لیکن زار کی حکومت کے ختم ہوتے ہی روسی سلطنت کا شیرازہ اس طرح بکھرا کہ تمام عناصر علیحدہ علیحدہ قومیں بن گئے۔ روس کے بالشویک انقلاب نے ان

Federal

تمام قوموں کی آزادی کو تسلیم کیا۔ اور اس کے بعد روس میں جو وفاقی نظام قائم ہوا وہ اِن آزاد ریاستوں کا سیاسی اتحاد ہے اور سوویٹ روس کا سوشلسٹ اتحاد کہلاتا ہے۔ فن لینڈ، اسٹونیا، لٹویا، لتھونیا، کا علاقہ اور پولینڈ کا ایک بڑا حصہ جنگ عظیم سے قبل روس کے قبضے میں تھا، لیکن انقلاب روس کے بعد ان ملکوں میں بسنے والی قوموں نے اکثریت کی حکومت میں رہنا پسند نہ کیا اور ہر ملک اپنی اپنی سیاسی آزادی کا طلبگار ہوا، چار پانچ سال تک اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ بنا، نزاع بنا رہا۔ یہاں تک کہ روس کو بالآخر اِن ملکوں کی علیحدگی تسلیم کرنی پڑی، اس کے علاوہ روس میں محض قومیت کے مسئلہ کو طے کرنے کے لئے جداگانہ جمہوریتیں قائم کی گئیں، ان جمہوریتوں میں بھی اقلیتیں موجود تھیں۔ ان کو سیاسی خود اختیاری دینے کے لئے جمہوریت در جمہوریت قائم کرنا پڑی، اب روس میں مندرجہ ذیل جمہوریتیں ہیں۔

(۱) سائبیریا جس میں کریمیا، کرانیا، دونگا وغیرہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں شامل ہیں۔

(۲) ٹرانس کاکیشیا جس میں داغستان جارجیا، آرمینیا، آوزبیجان کی چھوٹی چھوٹی جمہوریتیں شامل ہیں۔

(۳) سنٹرل ایشیا کی جمہوریت جس میں کازکستان۔ کراکلپک ترکمانستان ازبکستان، تاجکستان اور کرغیا کی جمہوریتیں شامل ہیں۔

(۴) سفید روس

(۵) یوکرین

موجودہ جنگ میں روس کے شمال و مغرب کی چند وہ ریاستیں جو پچھلی جنگ میں اس سے جدا ہوگئی تھیں (اسقطونیا، لیٹویا، اور لتھونیا) پھر روسی اتحاد میں شامل ہوگئی ہیں۔

وسطی یورپ کی اقلیتیں

جنگ عظیم میں اتحادیوں کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ یہ جنگ قومیت کے اصول کو بالا کرنے کے لئے لڑی جا رہی ہے اور اس کا مقصد کمزور قوموں کو سیاسی آزادی اور خود اختیاری حکومت دلانا ہے۔ انیسویں صدی میں حکومت خود اختیاری کو یورپ کی سیاست نے قومیت کا لازمی جزو قرار دے دیا تھا، اور یہ کوشش کی گئی تھی کہ یورپی ریاستوں کی حدود وہی ہوں جو وہاں کی مختلف نسلوں اور مختلف زبانیں بولنے والی قوموں کی ہیں۔ اس وجہ سے یورپ کی تمام محکوم اور کمزور قوموں میں اپنی اپنی آزاد ریاستیں قائم کرنے کی خواہش پیدا ہوگئی تھی۔ یہ خواہش جنگ عظیم میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی، چنانچہ وہ تمام محکوم قومیں جو وسطی یورپ میں آباد تھیں سیاسی خود اختیاری کی دعویدار ہوئیں۔ ترکی سرحد سے بیویریا تک اور سیکسنی سے وینس تک تمام علاقہ شہنشاہ آسٹریا کے ماتحت تھا جس میں خاندان ہیپ برگ کی حکومت تھی اس علاقہ میں رومانی، مجیار، جرمن، اطالوی، چیخ، سلوواک، پولستانی، سربی، کروٹی، کارنتھی اور بہت سی مختلف النسل قومیں آباد تھیں، اسی طرح جنوب میں ترکی سلطنت کے ایک بڑے علاقے میں سلافی عنصر آباد تھا۔ یورپ کے یہ سلافی تو ۱۸۷۸ء اور ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۴ء کی جنگوں کے بعد آزاد ہو گئے لیکن آسٹریا ہنگری

کی قوموں نے جنگ کے زمانے میں آزاد ہونے کی کوشش کی اور جنگ ختم ہونے سے چند ہفتے قبل ہی اپنی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا جنگ کے بعد صلحنامہ ویرسائی میں ان کی اس آزادی کو دول یورپ نے تسلیم کرلیا۔ اوران کی ریاستوں کی حدود متعین کردی گئیں۔ جس حصے میں جس قوم کی اکثریت تھی اسی کی ریاست قائم کردی گئی، دوسری قوموں کو جن کی تعداد کم تھی اقلیت قرار دے کر ان کے حقوق کا تحفظ کردیا گیا، اور ان کو اکثریت کے ماتحت کردیا گیا۔ اس تقسیم کے تحت اسٹریا ہنگری کی سلطنت کے مندرجہ ذیل سات حصے کردئے گئے:۔

(۱) آسٹریا جس میں زیادہ تر جرمن رہے،

(۲) ہنگری جس میں نوے فی صدی مجیار رہے۔

(۳) بوہیما، موراویا اور شمالی ہنگری کو ملا کر چیخوسلوواکیہ بنادیا گیا، جس کی آبادی زیادہ تر چیخ اور سلووک قوم پر مشتمل رہی،

(۴) کروشیا، دل ماتیا اور بوسینیا ہرزی گووینا جو یوگوسلاویہ کو دے گئے تاکہ سرب کروٹ اور سلوقومیں اپنی ہم قوم خودمختار حکومت کے تحت رہ سکیں،

(۵) گلیشیا جسے پولستان کے حوالہ کیا گیا۔

(۶) مشرقی ہنگری اور ٹرانس سلوانیا جو رومانیا کو دئے گئے۔

(۷) جنوبی ٹرول اور اسٹرین کا جزیرہ نما جو اطالیہ کے حوالہ کیا گیا،

اسی طرح جرمنی میں بھی بہت سی قوموں کے چھوٹے چھوٹے مجموعے آباد تھے۔ ۱۹۱۹ء میں ویرسائی کے صلحنامے کی رو سے ان اقلیتوں کو بھی جرمنی سے

علیحدہ کر دیا گیا۔ السا س اور لورین کے صوبے فرانس کو دے گئے۔ شمال میں شلس وگ کا ایک حصہ ڈنمارک کے حوالے کیا گیا۔ مشرق میں میمل لینڈ کا علاقہ لتھونیا کو دلایا گیا۔ مشرقی پروشیا اور پوزن کے صوبوں کا ایک بڑا حصہ نیز بالائی سلیشیا کا ایک چھوٹا سا حصہ چیکوسلوفاکیہ کو دیا گیا۔ اور ڈانزک کو ایک آزاد شہر قرار دے کر انجمن اقوام کی نگرانی میں رکھا گیا۔ موجودہ جنگ نے پچھلی جنگ کی تقسیموں کو درہم برہم کر دیا ہے۔ لیکن اس کی تفصیل یہاں درج کرنا قبل از وقت ہے۔ جنگ کے ختم ہونے تک نہ معلوم ابھی ان تغیرات میں کتنے تغیر اور ہوں!

وسطی یورپ میں اقلیتوں کا مسئلہ

انیسویں صدی میں حکومت خود اختیاری کو قومیت کا لازمی جزو قرار دیتے وقت یورپی سیاست کا عام رجحان یہ رہا تھا کہ ریاست کی حدود وہی ہوں جو قوم کی ہیں، لیکن ورسائی کے صلحنامے کے وقت وسطی یورپ میں اس اصول پر عمل درآمد کرنے میں بہت دقت پیش آئی، بہت سے علاقے ایسے تھے جن میں کئی کئی قومیں آباد تھیں، اور ان کو علیحدہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اس وجہ سے قومیت کی بنیاد پر ریاست کی تقسیم ناممکن تھی۔ چنانچہ جو نئی مملکتیں بنیں ان میں جن باشندوں کی اکثریت ہم زبان، ہم نسل، اور ہم مذہب تھی ان کی تو ایک آزاد ریاست قائم کرائی گئی اور اس ریاست میں بسنے والی دوسری قوموں کو جو تعداد میں کم تھیں اقلیت قرار دے کر اکثریت کے ماتحت کر دیا گیا۔ چنانچہ بلجیم، ڈنمارک، اسٹونیہ، لیٹویہ، لتھوانیہ، پولستان، رومانیہ، چیکوسلوفاکیہ،

یوگوسلافیہ، اٹلی اور ہنگری میں جرمن اقلیتیں آگئیں، رومانیہ اور چیکوسلوفاکیہ میں مجیار آگئے، اطالیہ اور اسٹریا میں سلافی شریک کر دے گئے، ترکی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ پہلے کی طرح روس، رومانیہ اور بلغاریہ کے ماتحت رہا! غرض تمام ریاستوں میں اقلیتیں آگئیں۔ حساب لگایا گیا ہے کہ وسطی یورپ کی تقریباً ایک چوتھائی آبادی ان اقلیتوں پر مشتمل ہے۔ مزید برآں ایسے علاقے بھی وجود میں آئے جن میں کسی قوم کی ایک چھوٹی سی تعداد کو اُس کی اکثریت سے جدا کرکے آزاد ریاست بنا دیا گیا تھا مثلاً اسٹریا اور ڈانزگ کو جرمنی سے جبراً علیحدہ کیا گیا تھا۔ ان تمام حالات نے وسطی یورپ میں اقلیتوں کے مسئلہ کو اس قدر پیچیدہ کر دیا ہے کہ وہ اس وقت تمام یورپ کی سیاست کا نازک ترین مسئلہ بن گیا ہے، جس وقت کوئی اقلیت اکثریت کی حکومت سے غیر مطمئن ہوتی ہے اور اپنی حفاظت کے لئے اپنی ہم قوم حکمراں اکثریت کے ساتھ ضم ہونا چاہتی ہے یا کوئی بڑی اکثریت اپنی اقلیت کی خواہش پر اُسے اپنے ساتھ ملانا چاہتی ہے تو یورپ کی سیاست کا سارا توازن بگڑ جاتا ہے۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں جب اسٹریا جرمنی کے ساتھ شامل ہوا تو یہی صورت حال پیش آئی، اسی سال جب چیکوسلوفاکیہ کے سوڈٹین علاقے کے جرمنوں نے جرمنی کے ساتھ شامل ہونا چاہا تو یورپ میں جنگ چھڑ جانے کا قوی امکان پیدا ہو گیا، اس کے بعد جب شہر ڈانزگ نے جرمنی کے سایہ میں آنا چاہا تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جنگ چھڑ ہی گئی اور اب تک جاری ہے۔

اینگلو سیکسن قوم | برطانوی قوم کے لاکھوں افراد دنیا کے دوسرے

ملکوں میں بسے ہوئے ہیں۔ اپنے وطن کو چھوڑ کر ان ملکوں میں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی ہے، اور اپنی آزاد ریاستیں قائم کر لی ہیں۔ مشترکہ نظام حکومت اور مشترکہ اقتصادی حالات کے ماتحت ہر ریاست کے باشندوں میں سیاسی وحدت پیدا ہو گئی ہے اس سیاسی وحدت کے احساس نے ان میں ایسا تشخص پیدا کر دیا ہے کہ وہ اپنے اور اصل برطانوی قوم کے درمیان امتیاز کرنے لگے ہیں۔ اپنے ملک میں انھوں نے اپنی قومی انفرادیت قائم کر لی ہے اور اپنے آپ کو علیحدہ قوم سمجھنے لگے ہیں۔ برطانیہ، کناڈا، ممالک متحدہ امریکہ اور اسٹریلیا کے باشندے اسی قسم کی قومیں ہیں۔ یہ سب اینگلو سیکسن قوم میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ جنوبی افریقہ کے ولندیزی، کناڈا کے فرانسیسی، ویلز کے جکٹ اور اسکاچستان کے مخلوط نسل کے باشندے بھی اینگلو سیکسن قوم ہی میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔ ان غیر قوموں نے بھی اپنی اپنی ریاستوں میں برطانوی قوم کے ساتھ سیاسی اتحاد قائم کر لیا ہے، اس لئے یہ بھی اینگلو سیکسن قوم کے مصنوعی معیار پر پوری اترتی ہیں۔

کناڈی قوم کناڈا کے مستعمرین دو حصوں پر مشتمل ہیں، ایک انگریزی زبان بولتا ہے اور دوسرا فرانسیسی، موخر الذکر کی تعداد پچیس فیصدی ہے، اور یہ اپنے انگریزی بولنے والے ہموطنوں سے نسل اور تہذیب میں مختلف ہیں۔ ان کو اپنی زبان حد سے زیادہ عزیز ہے، اپنے بچوں کو مدارس میں اپنی ہی زبان میں تعلیم دلاتے ہیں۔ مذہبی عقائد میں بھی یہ لوگ رومن کیتھلک گرجا کے پیرو ہیں، برخلاف اس کے انگریزی بولنے والے کناڈی پروٹسٹنٹ ہیں۔

رومن کیتھلک گرجا فرانسیسی بولنے والے کناڈیوں کو انگریزی بولنے والے کناڈیوں کے خلاف اُبھارتا رہتا ہے، اُس کو ہمیشہ یہ ڈر رہتا ہے کہ یہ اگر انگریزی کناڈیوں میں ضم ہو گئے تو اُس کے اپنے حق میں یہ بہتر نہ ہوگا، اسی طرح وہ یہ کوشش بھی کرتا رہتا ہے کہ اس کے پیرو برطانوی تاج کے وفادار رہیں کیونکہ برطانیہ نے کیتھلک گرجا کو اندرون ملک میں ہر قسم کی آزادی دے رکھی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ گرجا ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ کناڈا کے سیاسی اتحاد کا سخت مخالف ہے اور اس مخالفت سے برطانوی حکومت کی بنیادوں کو کناڈا میں پوری تقویت پہنچتی ہے۔

حالانکہ فرانسیسی کناڈی فرانسیسی تہذیب اور فرانسیسی علم و ادب کو اپنا قومی سرمایہ سمجھتے ہیں مگر فرانسیسی جمہوریت میں ضم ہونے کے لئے کسی طرح تیار نہیں، وہ اپنے تہذیبی مقاصد میں انگریزی کناڈیوں کے بالکل متضاد ہیں، مگر ان کی سیاسی قومیت پر اس کا کوئی اثر نہیں، کناڈا کی یہ دونوں قوتیں باوجود اپنے نسلی، لسانی اور مذہبی اختلاف کے بعض ملکی خصوصیات میں مشترک بھی ہیں، ان کی زندگی میں ملکی رنگ پایا جاتا ہے، ان کے اقتصادی اغراض یکساں ہیں۔ روایات مشترک ہیں۔ ان روایات کو دونوں یکساں طور پر باعث فخر سمجھتے ہیں، وطن کی محبت کا جذبہ دونوں میں ہے اور وطن کی خاطر دونوں متحد ہونے کے لئے ہر وقت تیار ہیں، برطانوی سلطنت میں رہ کر زیادہ سے زیادہ سیاسی آزادی حاصل کرنے کی کوشش میں دونوں برابر کے حصہ دار ہیں اور اپنی مملکت کے قیام و استحکام کے لئے دوش بدوش کوشاں ہیں۔

آئرِی قوم برطانوی سلطنت میں آئرِی قوم کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ بھی ایک آزاد قوم ہے، وہ بھی اپنی مخصوص قومی زندگی رکھتی ہے، اُس کی اپنی قومی تاریخ بھی جُدا ہے، اسی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ایک علیحدہ قوم سمجھتی رہی اور برطانیہ کے سیاسی اثر واقتدار کے ماتحت زندگی گزارنے کو تیار نہ ہوئی ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے انگلستان اور آئرستان کے مابین سیاسی اتحاد قائم ہو گیا تھا مگر یہ اتحاد آئرِی قوم کو پسند نہ تھا، سوراج کے لئے اُس کی جنگ برابر جاری رہی یہاں تک کہ برطانیہ کو مجبوراً اُسے بھی آزاد کرنا پڑا، چنانچہ ۱۹۲۱ء میں "آزاد ریاست آئرستان" کے لقب سے اُسے چھٹی نو آبادی قرار دیا گیا اور وہاں بھی کناڈا کی وضع کی حکومت تسلیم کی گئی، سیاسی آزادی کی کوشش کے ساتھ ساتھ آئرستان میں ملکی تحریک کے علمبرداروں نے قومی جذبات کو فروغ دینے کی بھی انتہائی کوشش کی، عوام میں تعلیم کو عام کیا گیا، اُن میں وطن اور تمام وطنی چیزوں کے ساتھ محبت کرنے کا جذبہ پیدا کیا گیا، ان کو ملکی روایات اور قومی تہذیب کی قدر کرنا سکھایا گیا اور اُن میں آزاد قومی زندگی گزارنے کی خواہش پیدا کی گئی۔

امریکی قوم امریکہ میں بھی قومیت کی ابتدا اسی طرح ہوئی جس طرح برطانوی سلطنت کی دوسری نو آبادیوں میں ہوئی، اب سے تقریباً دوسو برس پہلے امریکہ کی نو آبادیوں کے باشندے اور انگلستان کے باشندے ایک ہی قوم کے دو حصے تھے لیکن ۱۷۷۵ء میں امریکہ کی برطانوی حکومت

سے علیحدگی اس ملک میں قومیت کا پیش خیمہ بنی، اسی وقت سے امریکہ کے باشندوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ ایک جداگانہ قوم ہیں، وہ اپنے اور انگریزوں کے درمیان فرق کرنے لگے اور اپنی زندگی کو ایک خاص قومی رنگ دینے کی کوشش کرنے لگے۔ ابتداً یہ کوشش سیاسی غرض کے ماتحت تھی، وہ چاہتے تھے کہ اپنے ملک میں سیاسی اتحاد قائم کرکے برطانوی پارلیمنٹ کی اطاعت سے محفوظ رہ سکیں اور اپنی قومی آزادی کو قائم رکھ سکیں، جب سیاسی اتحاد قائم ہو گیا تو قومیت بھی مستحکم ہو گئی، قومیت پیدا کرنے والے بہت سے عناصر امریکہ میں موجود تھے، تین سو برس سے امریکہ انگریز مستعمرین کے قبضہ و تصرف میں ہے، اتنی مدت میں ان کے دلوں میں اس سرزمین کی محبت کا احساس پیدا ہو جانا لازمی تھا، پھر ملک کے جغرافی حالات کی یکسانی نے اس احساس کو اور بھی قوی کر دیا۔ زرعی حالت بھی ایک ہی سی ہے ان کی آبادی کا بھی زیادہ حصہ ان تیرہ نوآبادیوں کے انگریز مستعمرین کی نسل سے ہے جو سب سے پہلے امریکہ میں آباد ہوئے، اس وجہ سے امریکی قوم کی اکثریت کو اپنے ہم نسل ہونے کا بھی احساس ہے، لیکن قومیت پیدا کرنے میں جس عنصر کو سب سے زیادہ دخل ہے وہ جیسا کہ بتایا گیا ان کا سیاسی اتحاد ہے، امریکہ کی حکومت میں وہاں کے باشندوں کو جو اختیارات حاصل ہیں اور ان کے تعاون و تعاون سے جس طرح حکومت کا کاروبار چلتا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حکومت کو مقبولیت حاصل ہو۔ حکومت کے ساتھ امریکی قوم کی یہی وابستگی ان کے افراد کو باہم گر بستہ و پیوستہ کرتی ہے، ریاست

کی وفاداری اور اطاعت کی تعلیم جس قدر زیادہ امریکہ کے مدرسوں میں بچوں کو دی جاتی ہے شاید دنیا میں کہیں نہ دی جاتی ہوگی۔ اسی طرح امریکہ میں باہر سے آنے والوں کو امریکہ کا شہری بننا جس قدر دشوار ہے اس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔

قومیت کے بننے میں زبان و ادب کو جو دخل ہے امریکی قوم کو اس کا پورا احساس ہے چنانچہ امریکہ کی ریاستہائے متحدہ میں ایک ہی زبان بولی جاتی ہے۔ جو لوگ دوسرے ملکوں سے آکر امریکہ میں بس جاتے ہیں ان کے لئے اس ملک کی زبان سیکھنا ضروری ہے۔ زبان سے ان کا تخیل اور ان کی نفسیات دونوں متاثر ہوتے ہیں، زندگی کے متعلق ان کا مطمح نظر بھی وہی بن جاتا ہے جو ملک میں رائج ہے، رفتہ رفتہ ملکی تہذیب ان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔ امریکہ کی تہذیب اپنی جداگانہ خصوصیات رکھتی ہے۔ امریکی قوم کی سیاسی زندگی ان کے قوانین، ان کی زبان، ان کے رسم و رواج سب اپنی ہی وضع کے ہیں، ان کے ادب کا طرز بھی جداگانہ ہے، ان کے مصنفین کا عام رجحان اس طرف ہے کہ امریکہ اور انگلستان کے ادب میں اتنا ہی فرق ہونا چاہیئے جتنا کہ ان دونوں ملکوں کی زندگی میں ہے۔

امریکہ کے باشندے جسم و جثے اور شکل و شباہت میں تو ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہی ہیں، معاشی اور تجارتی زندگی کے مشترک اغراض نے ان کے مزاج اور سیرت کو بھی ایک ہی سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ ان کا مخصوص لباس، ان کی عمارات کی مخصوص وضع، ان کے مخصوص اطوار و عادات ان کا

مخصوص مذاق وہ چیزیں ہیں جنھوں نے ان تہذیب کے مادّی پہلو کو تمام ملک
کے طول و عرض میں یکساں کر دیا ہے، ملک کے ایک حصّے سے دوسرے
حصّے تک شادی کے رسم و رواج، دوستوں سے تعارف کرانے کا طریقہ،
روزانہ کی زندگی کے عام معمولات بالکل ایک ہی سے پائے جاتے ہیں، ان
تمام چیزوں کے لئے ملک میں ایک ہی معیار ہے اور وہی قابل عمل ہے یہاں
تک کہ مشترکہ قومی مسائل پر ملک میں اختلاف رائے بھی یک قلم مفقود نظر آتا ہے۔
امریکی ریاستوں کی گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی تاریخ مسلسل ترقی کا زمانہ ہے، پہلی
تیرہ نو آبادیاں پھیلتے پھیلتے شمالی امریکہ کے نصف رقبے پر چھا گئی ہیں۔ اس
سرزمین میں بے شمار دولت ہے اور کل آبادی ایک سو بیس ملین ہے۔
آج تک اس قوم نے شکست کا منھ نہیں دیکھا، ان تمام باتوں نے
ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کر دی ہے، انھیں اپنے کارناموں پر ناز
ہے، اس لئے اپنی روایات کو اُن جماعتوں میں جو باہر سے آکر امریکہ میں
آباد ہو گئی ہیں پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لاکھوں جرمن
جو امریکہ میں آکر آباد ہوئے امریکی بن گئے، امریکی قوم دوسروں کو اس
طرح اپناتی ہے کہ پھر اُن کی نفسیات، اُن کا فلسفۂ حیات، ان کے نظریات،
ان کا علمی اور فنّی مذاق بالکل ویسا ہی ہو جاتا ہے جیسا خود امریکی قوم کا۔
گزشتہ پچاس سال میں دنیا کے ہر ملک سے امریکہ میں مہاجرین پہنچے
ہیں، اس طرح مختلف تہذیبوں اور نسلوں کے عناصر امریکہ کی آبادی میں
شامل ہو رہے ہیں، ان میں سے بعض اپنی قومی انفرادیت کھو کر امریکی

بلنے کو تیار نہیں ہیں ۔ جرمنی اور اسکینڈی نیوی قومیں جن علاقوں میں کثرت
سے آباد ہیں وہاں وہ اپنی ہی ملکی تہذیب کو رائج کر رہی ہیں، اسی وجہ
سے اب امریکہ میں غیر قوموں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا ہے ۔

باب ۴

مشرق میں قومیت

تاریخ کے قدیم زمانے سے مشرق تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے، دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کے مرکز مشرق ہی کی سرزمین میں تھے، جہاں علوم و فنون اور فلسفہ و حکمت نے نشوونما پائی۔ زندگی کے اعلیٰ مقاصد کا حصول اہل مشرق کا نصب العین تھا، وہ زندگی کی بنیادیں اخلاق پر قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ان کی معاشرت کی بنیاد مذہب پر قائم ہوئی، یہی ان کی قومیت تھی۔ ہر مذہب عالمگیر اخوت پر مبنی ہوتا ہے اس وجہ سے مشرق کی تاریخ میں جدید قومیت کا تصور ہمیں اس وقت تک مفقود نظر آتا ہے جب تک کہ اہل مغرب کے قدم مشرق میں نہ آئے۔ عہد وسطیٰ کے ساتھ مشرق کے علوم و فنون کی ترقی کا زمانہ ختم ہوا، مشرقی تہذیب کی ساری آب و تاب ماند پڑ گئی اور اہل مشرق کی زندگی پر عام جمود چھا گیا، عہد جدید میں مشرق تو اضمحلال کی ان منزلوں سے گزر رہا تھا مگر مغرب ترقی کی شاہ راہ پر گامزن تھا۔ یورپ میں علوم و فنون تیزی کے ساتھ اپنی ارتقائی منازل طے کر رہے تھے، یہاں تک کہ یورپی تہذیب کا

وہ دور شروع ہوا جسے صنعتی دور کہتے ہیں، اسی دور میں یورپ میں قوم پرستی
بھی اپنی انتہا کو پہنچی۔ صنعتی ترقی نے یورپ کی قوموں میں اپنی دولت و
طاقت بڑھانے اور اپنی قومی عظمت کا سکہ جمانے کی خواہش حد سے
فزوں کردی۔ خام مال اور تجارتی منڈیوں کے لئے انھوں نے اپنی اپنی
ملکتوں سے باہر نظر دوڑائی اور مشرق کی کمزور اقوام کو اپنی ہوس زر کا نشانہ
بنایا۔ مشرقی ملکوں میں اس وقت کسی قسم کی تنظیم نہ تھی، اس لئے اہل مشرق
مغرب کی سرمایہ داری ملوکیت اور استبداد کا شکار ہوئے لیکن انیسویں
صدی میں مغربی تہذیب کی انھیں خصوصیات نے مشرق کو نیند سے چونکایا۔
مغربی اقوام کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کے قدم بھی مشرق میں آئے،
مغربی خیالات اور تصورات مشرق میں عام ہونے لگے، جن ملکوں کو
اہل مغرب سے زیادہ واسطہ تھا وہی ان سے متاثر بھی زیادہ ہوئے،
اس وقت یورپ میں قومیت کا ڈنکا بج رہا تھا، قومیت ہی کے جذبہ
نے یورپ کی قوموں میں علوم وفنون صنعت و حرفت اور حکومت وتجارت
کو بام عروج تک پہنچایا تھا، اس وجہ سے مشرق نے بھی قومیت کو اپنی
ترقی کا ذریعہ سمجھا، چنانچہ مشرقی قوموں میں ایک عام بیداری پیدا ہونے
لگی وہ اپنی قومی زبانوں کو ترقی دینے لگیں، اپنے ملکی ادب اور فن کو زندہ
کرنے لگیں، مذہبی ادب کو قومی زبانوں میں منتقل کرنے لگیں، اور اپنے ماضی
کی بھولی ہوئی روایات کی یاد کو پھر تازہ کرنے لگیں، ہر ملک میں معاشرتی
اصلاح کی کوشش شروع ہوئی اور اسی کے ذریعے قومی زندگی کی تنظیم

وجود میں آئی، یورپی قومیت کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ہر قوم سیاسی خود اختیاری کی مستحق سمجھی جاتی ہے، مشرق کی کمزور اقوام نے بھی مغربی قوموں کی حکومت کے خلاف آواز اٹھائی اور جمہوری حکومت کا مطالبہ کیا۔ جمہوریت کے خیال کو بالشویکی روس کے انقلاب نے اور بھی زیادہ تقویت پہنچائی۔ روس خود ایشیا کا ایک حصہ ہے، اس لیے معاشرتی تنظیم کا جو خاکہ پیش کیا اس کی وجہ سے قومی آزادی کی خواہش بہت عام ہوگئی، اسی زمانے میں ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں یورپی قوموں کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ یہ جنگ قومیت کے اصول کی خاطر لڑی جا رہی ہے تاکہ کمزور اقوام کا حق آزادی تسلیم کرایا جائے، چنانچہ جنگ کے اختتام پر یورپ کی ان تمام قوموں کو آزاد بھی کیا گیا جنھوں نے قومیت کی بنیاد پر آزادی کا مطالبہ کیا، یہ مثال بھی مشرق کی قوموں کے لئے ہمت افزا تھی۔ ان کی آزادی کی خواہش روز افزوں ترقی کرتی گئی، حکمراں قوموں کی طرف سے اس خواہش کو روکنے کی جتنی زیادہ کوشش ہوئی قومیت کے جذبات اسی قدر زیادہ ابھرے۔

چین

قدیم تہذیبوں میں چین کی تہذیب غالباً قدیم ترین ہے چین تقریباً پانچ ہزار سال سے متمدن ہے۔ ماہرین اثریات کا خیال ہے کہ اہل چین ان اقوام پر مشتمل ہیں جو کسی زمانے میں ہند چینی سے شمالی اسٹیپ کے خطہ تک آباد تھیں، ان اقوام نے ایک دوسرے کے ساتھ ضم ہوکر اپنا مشترک نظام حکومت قائم کیا۔ اور ان میں مشترک تہذیب

نشو ونما پانے لگی۔ یہ تہذیب اپنے آس پاس کی تہذیبوں پر اتنی فوقیت رکھتی تھی کہ قرب وجوار کے ممالک میں سے جب کبھی کسی غیر ملک نے چین پر حملہ کیا یا چین نے کسی دوسرے ملک کو فتح کیا تو غیر ملکی تہذیب چینی تہذیب کا ایک جز بن گئی۔

سیاسی حیثیت سے چین میں مدتوں جاگیر دارانہ نظام قائم رہا جن میں مقامی امرا اور جاگیر داروں کی طاقت شاہنشاہ کے اثر واقتدار سے کہیں زیادہ ہوتی تھی چنانچہ چین کی سلطنت بھی روما کی سلطنت کی طرح غیر منظم ہی رہی۔ چین میں مرکزی حکومت کے مستحکم نہ ہونے کے بہت سے اسباب تھے۔ چین پر برابر باہر والوں کے حملے ہوتے رہے اور خود چین کے اندر حکمراں خاندانوں کی تبدیلیاں اور پھر تخت نشینی کے لئے اُن کے آپس کے نزاعات ہمیشہ ملک کے سیاسی اتحاد کے لئے مضر ثابت ہوئے۔ سلطنت کی وسعت، بعض اطراف میں واضح جغرافی حدود کا فقدان، اور وسائل آمدورفت کی کمی نے بھی مرکزی حکومت کو کبھی مستحکم نہ ہونے دیا۔ باایں ہمہ اہل چین اپنی تہذیب کی وجہ سے جو ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بالکل یکساں تھی ایک قوم بنے رہے اور اس تہذیب ہی کو وہ ہمیشہ اپنے اور دوسری قوموں کے درمیان مابہ الامتیاز چیز سمجھتے رہے۔

انیسویں صدی میں جب اہل یورپ چین کے بندرگاہوں میں تجارت کی غرض سے آئے اس وقت چین کی مرکزی حکومت حد درجہ کمزور ہو چکی تھی،

اس کے پاس نہ معقول تعداد فوج کی تھی نہ پولس کی۔ ہر گاؤں اپنی اپنی آزاد حکومت رکھتا تھا۔ ملک کی اقتصادی حالت بھی بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ عوام اپنی کشاکش حیات میں اس درجہ مصروف تھے کہ ذاتی اغراض کے مقابل قومی مفاد کی طرف اُن کی ذرا توجہ نہ تھی۔ صوبوں میں زبان و معاشرت کے اختلافات روز افزوں ترقی پر تھے۔ شمالی مغربی حصہ میں مسلمانوں کی آبادی کی وجہ سے چین کی مذہبی یکسانی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ ان حالات میں یورپی قوموں کو موقع مل گیا کہ چین کی مردہ لاش کو آپس میں تکا بوٹی کرلیں چنانچہ برطانیہ، فرانس جرمنی روس امریکہ اور خود چین کا پڑوسی جاپان اُس کے معاملات میں مداخلت کرنے لگے اور اپنا سیاسی اثر و اقتدار قائم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

اہل یورپ کی آمد کے ساتھ ساتھ چین میں یورپی خیالات رواج پانے لگے تھے اور یورپی قومیت کا تخیل چینیوں کے دماغ پر قابو پانے لگا تھا۔ سائنس کے علوم بھی چین میں عام ہوتے جا رہے تھے۔ ان حالات کے ماتحت چینیوں کا اپنی نیند سے کروٹ لینا کچھ تعجب انگیز نہ تھا۔

چینی سلطنت کو آپس میں تقسیم کرنے کے لئے بیرونی طاقتوں کی طرف سے جو ریشہ دوانیاں ہو رہی تھیں انھوں نے چینیوں میں قومیت کے احساس کو بیدار کیا۔ چینی قومیت نے سب سے زیادہ ترقی گزشتہ بیس سال میں کی ہے اور یہ ترقی دراصل غیر ملکی اثر و اقتدار کے خلاف ردّ عمل ہے۔ انیسویں صدی میں اہل یورپ نے چین میں جو مخصوص حقوق حاصل

کر لئے تھے ان کے ماتحت اب تک چینی قانون کا نفاذ غیر ملکیوں پر نہیں ہو سکتا۔ ان کے مقدمات غیر ملکی عدالتوں میں ان کے اپنے قوانین کے مطابق اپنے ہی ججوں کے ذریعے طے پاتے ہیں۔ شانگھائی کا ایک حصہ غیر ملکیوں کے بسنے کے لئے اور ان کی عدالتوں وغیرہ کے لئے دے دیا گیا ہے۔ غیر ملکیوں پر چینی ٹیکس یا چنگی کا عمل درآمد نہیں ہو سکتا۔ تجارتی اشیائے برآمد پر پانچ فیصدی سے زیادہ ٹیکس چینی حکومت نہیں لگا سکتی۔ درآمد کے ٹیکس سے غیر ملکی بری سمجھے جاتے ہیں۔ مزید برآں چین غیر ملکیوں کے قرضہ میں جکڑا ہوا ہے۔ اپنی جنگوں کے اخراجات اور ہرجانوں کی ادائیگی کے لئے چین کو برطانیہ، فرانس، جرمنی، امریکہ روس اور جاپان سے جو قرضے لینا پڑے تھے اور جو ۱۹۱۲ء میں قیام جمہوریت کے وقت سے اور بھی زیادہ ہو گئے چین پر غیر ملکیوں کی گرفت کو بڑھاتے رہے یہاں تک کہ چین کلیتاً ان کا دست نگر ہو گیا۔

جس وقت سے یورپی طاقتوں کا اثر چین میں قائم ہونا شروع ہوا تھا چینیوں کی ایک جماعت اس کی مخالف تھی، وہ اس کو اپنی قومی تذلیل سمجھتی تھی اور اس کے نزدیک اہل چین اور اہل یورپ کے درمیان اس قسم کے امتیازات کا قائم کیا جانا چینی تہذیب پر مغربی تہذیب کے فتح پانے کا مرادف تھا۔ رفتہ رفتہ یہ خیالات ملک میں پھیلتے رہے۔ ۱۸۹۴ء-۱۸۹۵ء میں ایک طرف تو جاپان نے چین کو شکست دی اور دوسری طرف یورپی طاقتیں چین کو آپس میں تقسیم کر لینے کے منصوبے بنانے لگیں۔

ان دو واقعات سے چین میں وطنیت کے جذبات برانگیختہ ہوئے اور دو قومی تحریکیں وجود میں آئیں ۔ ایک تو ڈاکٹر سن یات سن کی قومی تحریک تھی جس کا مقصد چینیوں کو یورپی علوم کی طرف رغبت دلانا اور ان کے ذریعے چینی قوم کو اس قابل بنانا تھا کہ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ ترقی کر کے دنیا میں زندہ رہ سکے اور دوسری تحریک وہ تھی جو "مکہ بازوں کی بغاوت" کے نام سے مشہور ہے اور سنہ ۱۹۰۰ء میں وجود میں آئی اس کا مقصد چین کو تمام غیر ملکی اثرات سے پاک کرنا تھا ۔ اول الذکر تحریک ملک میں عام مقبولیت حاصل کرتی گئی یہاں تک کہ سنہ ۱۹۱۱ء میں ڈاکٹر سن یات سن نے "کومن تانگ" یعنی چینی جماعت عوام قائم کی جس نے اس وقت سے اب تک چین کی سیاسی زندگی میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔ چین کی وہ انقلابی تحریک جس نے سنہ ۱۹۱۲ء میں منچو خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر کے چین میں جمہوریت قائم کی اسی جماعت عوام کا کارنامہ تھی ۔ لیکن اس وقت تک چینی قوم پوری طرح بیدار نہیں ہوئی تھی اور قومیت کا تخیل چینی عوام کے ذہنوں میں پوری طرح قائم نہیں ہوا تھا ۔ نہ ان میں سیاسی شعور پیدا ہوا تھا ۔ اس وجہ سے حکومت فوجی سپہ سالاروں کے ہاتھوں میں پہنچی اور ملک میں جنگ و جدل کی خوب گرم بازاری رہی ، سنہ ۱۹۲۸ء میں چین میں ہر جگہ جنگ ہو رہی تھی لیکن اسی سال جنرل چانگ کائی شیک نے دوسرے فوجی سپہ سالاروں سے اتحاد کر کے ملک میں امن و امان قائم کرنا شروع کیا اور دارالسلطنت پیکن سے

نانکن کو منتقل کیا جہاں کومن تانگ نے جدید حکومت کا دستور مرتب کیا۔
مارشل چیانگ کائی شیک چین کا موجودہ صدر و سپہ سالار اعظم چینی قومیت کی تجدید میں مصروف ہے۔ اہل ملک میں خود داری اور زندگی کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ نظم اور باضابطگی کے ذریعے حکومت کی بنیادوں کو مضبوط کیا جا رہا ہے، اور اہل ملک کے مقاصد و عمل میں اشتراک اور اتحاد پیدا ہو رہا ہے۔
جنگ عظیم میں چین کی شرکت نے چینی قومیت کے جذبات کو بہت اُبھارا۔ چنانچہ جنگ کے ایک فاتح کی حیثیت سے چین نے اپنے ملک میں جرمن اور روسیوں کو ان کے مخصوص حقوق سے محروم کر دیا لیکن قومی جذبہ کو جس چیز نے سب سے زیادہ تقویت پہنچائی ہے وہ جاپان کی دشمنی ہے۔ اس وقت جاپان ہی غیر ملکیوں میں چین کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ جاپان کی چیرہ دستیوں پر موجودہ جنگ میں جس ہمت اور استقلال کے ساتھ چین مقابلہ کر رہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چین میں اندرونی اختلافات مٹتے جا رہے ہیں اور قومی وحدت کا احساس پختہ ہوتا جاتا ہے فی زمانہ چینی قومیت میں قدیم اور جدید دونوں عناصر پائے جاتے ہیں۔ چین کو اپنے تہذیبی کارناموں پر بڑا فخر ہے۔ یہ جذبہ اہل ملک میں عام ہوتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وطن کی محبت کے جذبات بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ ان جذبات کو ملک میں عام کرنے کی پوری پوری کوشش کی جا رہی ہے، چین کے مدرسوں میں قومیت کی

تعلیم دی جاتی ہے، اور نوجوانوں کو اُن کے ماضی کی عظمت کا احساس پیدا کرایا جا رہا ہے، چینی قوم محسوس کرنے لگی ہے کہ جب تک وہ اپنے آپ کو مستحکم بنیادوں پر ایک قومی ریاست نہ بنائے گی اُس کا زندہ رہنا ناممکن ہے۔ اس کی گزشتہ پچاس سالہ تاریخ بتا رہی ہے کہ قومی اتحاد کے فقدان نے اُسے موت سے ہم آغوش کر دیا۔ اپنے آپ کو ایک زندہ قوم بنانے کے لئے وہ ایک طرف تو اپنی قدیم تہذیب کو قائم رکھنا ضروری سمجھتی ہے اور دوسری طرف دنیا کے جدید علوم و فنون کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ڈاکٹر سن یات سین کی تعلیم کا یہی ماحصل تھا۔ اور اسی مقصد کی طرف اس نے قوم کو بڑھایا، چنانچہ آج چینی قوم دنیا کی تمام دوسری قوموں سے اشتراک کرنے کو تیار ہے، اور اُن کے علوم و فنون سیکھنے کی خواہشمند ہے۔ چینی قومیت کی ایک نمایاں خصوصیت اہلِ چین کی موجودہ فوجی تنظیم ہے۔ فی زمانہ "عسکریت" قومیت کا لازمی جُزو بن گئی ہے۔ چنانچہ چین بھی اپنے اندر اس خصوصیت کو پیدا کر رہا ہے۔

جاپان مشرقی ملکوں میں جاپان ایک ایسا ملک ہے جو قومیت میں یہاں کے تمام ملکوں سے آگے ہے اور دنیا کی دوسری قومی ریاستوں کے دوش بدوش ہے۔ جاپان کی قومیت کا آغاز ۱۸۶۷ء سے ہوا ہے اور گزشتہ ستر سال میں اُس نے اپنے جاگیرداری کے نظام کو ختم کر کے اپنی قوم کو متحد کرنے اور اُس میں وطنیت کا جذبہ پیدا کرنے کی پوری

پوری کوشش کی ہے جغرافی، مذہبی، نسلی اور لسانی اشتراکات نے
جاپانیوں کے اندر قومی اتحاد کے جذبہ کو ابھرنے کا پورا پورا موقع دیا ہے۔
اُن کے اقتصادی حالات کی یکسانی بھی قومی وحدت پیدا کرنے میں بہت
کچھ ممد ہوئی ہے۔

جاپان ایک جزیرہ ہے جس کی سرحد کسی دوسرے ملک سے نہیں
ملتی، اس علیحدگی کی وجہ سے اس کی ملکی تاریخ زیادہ تر اپنے جغرافی حالات
ہی کے ماتحت بنی ہے۔ اس کا سیاسی اتحاد اور اس کی آزادریاست
بھی اپنے قدرتی حالات ہی کے رہین منت ہیں۔ یہی تمام عناصر جاپانیوں
میں ابتدائً قومیت کے محرک ہوئے لیکن قومیت کو جس چیز نے سب
سے زیادہ تقویت پہنچائی وہ اُن کا مذہبی اشتراک ہے اور اسی وجہ
سے ان کی قومیت نہایت گہرا مذہبی رنگ رکھتی ہے۔

جاپانیوں کا عقیدہ ہے کہ وہ دیوتاؤں کی نسل سے ہیں اور ان کا
ملک دیوتاؤں نے بنایا ہے۔ عام طور پر اُن کے مدارس میں اس عقیدہ
کی تعلیم دی جاتی ہے۔ وہ اپنے شاہنشاہوں کو اُن دیوتاؤں کا جانشین
سمجھتے ہیں جنھوں نے جاپان بنایا ہے۔ اس وجہ سے اس کی اطاعت
اُن کا مذہبی فرض ہے۔ جاپان کی تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہ ملے گی
کہ کسی جاپانی نے اپنے شاہنشاہ کی اطاعت سے سرگردانی کی ہو۔
جاپانیوں کی کوئی سیاسی تحریک اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی
جب تک کہ اُسے شاہنشاہ کی رضامندی حاصل نہ ہو۔ ان روایات نے

مذہبی حکومت کے اثر و اقتدار کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اور رعایا کی نظروں میں اُسے خاص اہمیت دے دی ہے، مشترک نظام حکومت کے ساتھ اہل ملک کی یہ وابستگی ہی اُن کی قومیت کا اصل سبب ہے۔ جاپان میں سیاسی جماعتوں کے درمیان اختلاف رائے بہت محدود ہے۔ اگر ہے تو صرف طریق کار کا ہے ورنہ ان کے مقاصد کلیتاً یکساں ہیں۔ اختلاف کے اس فقدان کا ایک سبب تو یہ ہے کہ وہ سب شاہنشاہ کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ اپنے ملک پر باہر والوں کے قبضہ و اثر کے خلاف متحد ہو جانے کے لئے وہ ہر وقت تیار رہتے ہیں، آج تک اپنے اندرونی نزاعات کے سلسلے میں جاپانیوں نے کبھی کسی بیرونی طاقت سے مدد طلب نہ کی اور اس طرح ہمیشہ اپنے ملک کو باہر والوں کی دست بُرد سے محفوظ رکھا۔ جاپان میں سپاہیانہ جوہر ہمیشہ وقعت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ اور جاپانیوں نے ہمیشہ اپنی ملکی فوج کو اپنی قومی عظمت کا ذریعہ سمجھا۔ اسی وجہ سے جاپانی فوج کو جاپان کی قومی زندگی میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان کے فوجی سرداروں کا خیال ہے کہ قوم کی قسمت کے بنانے والے وہی ہیں۔ ملک کی وزارتوں کو وہ اپنے حکم کا تابع سمجھتے ہیں جنگوں میں جاپان کی کامیابی نے ملک میں عسکری فضا قائم کرنے اور فوجی تنظیم کا ذوق پیدا کرنے میں بہت مدد دی ہے، ۱۹۰۵ء میں روس اور جاپان کی جنگ میں جاپان کی فتح نے جاپانیوں کے قومی جذبہ کو اور بھی زیادہ ترقی دی۔

انیسویں صدی میں مغربی تہذیب کے اثرات جاپان میں بھی رونما

ہوئے لیکن اس ملک کے جغرافی، تہذیبی اور معاشرتی حالات کچھ ایسے تھے کہ اہلِ مغرب یہاں اپنے قدم نہ جما سکے، مغربی تہذیب کے صرف وہ اصول جاپانیوں نے اختیار کر لئے جو اُن کے لئے مفید تھے مثلاً فوج اور جہازی بیڑے کو جدید طریقوں پر ترتیب دیا۔ اور اپنے سیاسی اور اقتصادی نظام کی اس طرح تنظیم کی کہ یورپی طاقتوں کو اُن کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اور نہ وہ جاپان کی طاقت کا آسانی سے مقابلہ کر سکیں۔ بہت جلد جاپانی ریاست کی سیاسی خود اختیاری مستحکم ہو گئی اور اُس نے ان تمام سیاسی اور تجارتی معاہدوں کو ختم کر دیا جو مغربی طاقتوں کے ساتھ ابتدائی دور میں کئے گئے تھے۔ ہندوستان اور چین میں اسی قسم کے معاہدے غیر ملکی حکومتوں کے اثر و اقتدار کے قیام کا باعث ہوئے تھے۔ لیکن جاپان نے اپنی اقتصادی حالت کو بہتر بنا کر اپنے ملک کو غیروں کے تسلط سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا۔ جاپان نے صنعتی تنظیم کے اصول کو اپنے یہاں اسی طرز پر جاری کیا ہے جیسے کہ مغربی ممالک میں ہے۔ لیکن جاپانیوں کی قدیم معاشرتی زندگی کے ساتھ اس اصول کا امتزاج کچھ مفید نہیں ثابت ہو رہا ہے۔ چنانچہ آج کل اُن کی فوج کے بعض وطن پرست حلقوں میں اس کی شدت کے ساتھ مخالفت کی جا رہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یورپی طرز پر ملک کی صنعتی تنظیم سے جاپان کی تہذیبی روایات خطرے میں ہیں۔ جاپانیوں کے معاشی اغراض یکساں ہیں۔ اپنے اقتصادی مفاد کے تحفظ کے لئے

وہ سب یکساں طور پر کوشاں ہیں۔ یہ معاشی یکسانی بھی ان کی موجودہ قومیت کو ابھارنے میں بہت مدد دے رہی ہے، ان کی صنعت وحرفت آناً فاناً ترقی کر رہی ہے۔ ان کے ملک کا رقبہ اتنا کم ہے کہ اس سے ان کی معاشی ضروریات کا پورا ہونا ناممکن ہے، ان کی آبادی روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ اپنی تجارتی ترقی کے لئے انھیں کچا مال اور تجارتی منڈیاں درکار ہیں۔ ان تمام عناصر نے جاپانی قوم میں بھی مطلق العنانی کا وہی جذبہ پیدا کر دیا ہے جو اس وقت یورپ کی دوسری قوموں میں ہے جاپان کے نظام سرمایہ داری نے جاپانیوں میں ملک گیری اور غریب آزاری کے جو حوصلے پیدا کر دئے ہیں وہ یورپی قوموں کے حوصلوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ چنانچہ جاپان کی قومی ریاست اپنے اغراض کی خاطر دوسری قوموں کے مفاد کو نظر انداز کر کے دنیا کے امن وامان کے لئے اسی طرح خطرہ بنی ہوئی ہے جیسے کہ یورپ اور امریکہ کی دوسری قومی ریاستیں۔

ہندوستان کی قومی تحریک ہندوستان میں بھی جذبۂ قومیت کے ابھرنے کا باعث یہاں غیر ملکی حکومت کا قیام ہے، اٹھارویں صدی کے آخر میں یہاں برطانوی حکومت قائم تھی، یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ کی قوموں میں قومیت اپنی پوری نشوونما کو پہنچ چکی تھی۔ ان قوموں کی بڑھتی ہوئی طاقت نے قومی خودغرضی کو قومیت کا معیار قرار دیا تھا، اور دنیا کی کمزور اور غیر منظم قومیں اس خودغرضی کا نشانہ تھیں، قومیت کا نصب العین اقتصادی منفعت، سیاسی طاقت اور حکومت

تھا، چنانچہ اسی نصب العین کے ماتحت، ہندوستان پر بھی قبضہ ہوا، اور دوسروں کے قومی مفاد کی خاطر ہندوستان کے مقاصد پس پشت پڑ گئے، برطانوی شاہنشاہیت کے دو صد سالہ دور میں ہندوستان اقتصادی اور معاشرتی دور میں اوروں سے بہت پیچھے ہوگیا۔ بیرونی حکومت کا بوجھ ہندوستانیوں کو کھلنے لگا خود اختیاری مملکت کی آرزو ایک قومی دلولہ کی حیثیت سے کام کرنے لگی اور قومیت کا تصور ہندوستانی دماغ میں جگہ پانے لگا۔ اور اس وقت ان کی نظروں کے سامنے یورپی قومیت کا نمونہ تھا جس کی نمایاں خصوصیت اور جس کا سب سے بڑا دعویٰ یہ ہے کہ ہر قوم اپنے ملکی اور سیاسی معاملات میں آزاد اور خود مختار ہو، چنانچہ ان کے دلوں میں حکومت خود اختیاری اور سوراج کی خواہش پیدا ہوئی، اگرچہ شروع میں ہندوستان کا مطالبہ صرف آئین حکومت میں اصلاح کا تھا لیکن رفتہ رفتہ آزادی کی خواہش بڑھتی گئی، اور اب ملک کا سیاسی نصب العین مکمل قومی آزادی ہے، یہ مطالبہ ہندوستان کی ہر سیاسی جماعت کا ہے، اور اس حد تک ہر جماعت ایک دوسرے سے متفق ہے۔

قومیت کا وہ اصطلاحی مفہوم جس میں ایک ملک کے تمام افراد اپنے نسلی، مذہبی، لسانی، اور تہذیبی اشتراک کی وجہ سے ایک جماعت اور اپنی ذہنی روحانی اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی حیثیت سے ایک گروہ بن جاتے ہیں نہ کبھی ہندوستان میں تھا نہ اب ہے، اپنی وسعت کے اعتبار سے ہندوستان ایک وسیع براعظم ہے اور مختلف نسلوں، مذہبوں،

قوموں، ذاتوں اور تہذیبوں کا مجموعہ ہے۔ یہ صورت حال نئی نہیں ہے، قدیم زمانہ سے ہندوستان کی تاریخ یوں ہی چلی آتی ہے۔ یہاں کے باشندے روایات، زبان، ادب، طرز زندگی، اخلاقی خصائص، جذبات وحسیات، خیالات و نظریات کے لحاظ سے کبھی ایک جماعت نہ ہوئے اور نہ ہوسکتے ہیں، اس ملک میں تہذیبوں اور نسلوں کے اختلاف کو ہمیشہ تسلیم بھی کیا گیا، اس کی مثال قدیم زمانہ کا ذاتوں کا آریائی نظام ہے جو آج تک برقرار ہے، یہ ضرور ہے کہ مختلف تہذیبوں کے میل جول سے وہ تہذیب بن سکی جسے ملکی تہذیب کہا جاسکتا ہے اور جس کی بدولت مختلف نسلوں اور تہذیبوں میں اتحاد و یگانگت قائم رہی اور ملک میں قومی وحدت کا احساس باقی رہا۔ عہد وسطیٰ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے ہندوستانی تہذیب نے جو رنگ اختیار کیا اس نے قومیت کے جذبہ کے ابھرنے کی راہ کھول دی، نسل اور مذہب کے اختلافات کے باوجود ہندوستانیوں کے فلسفہ زندگی رسم و رواج اور طرز معاشرت میں ایک طرح کی یکسانی پیدا ہوگئی۔

مسلمان بارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان آئے، ان کی پہلی کوشش یہ تھی کہ اس ملک میں سیاسی وحدت قائم کردیں، اس سے قبل صرف دو مرتبہ ہندوستان ایک چھتر کے نیچے آیا تھا، پہلی دفعہ تیسری صدی قبل مسیح میں موریہ خاندان کے زمانے میں اور دوسری دفعہ چوتھی صدی عیسوی میں گپت خاندان کے عہد میں۔ مسلمانوں نے ڈیڑھ سو برس کے اندر ہی اندر

بلوچستان سے آسام تک اور پشاور سے مدورا تک متحدہ ریاست قائم کردی، سیاسی اتحاد کا حوصلہ ان کے دلوں میں اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ اس کی خاطر انھوں نے نسل اور مذہب کے فرق کی مطلق پرواہ نہ کی۔ وہ ہندوستان میں رہے اور ہندوستانی بن کر رہے، حاکم و محکوم کے درمیان نسل اور مذہب کا اختلاف اس طرح مٹ گیا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہو گیا مسلمانوں نے اس ملک کو اپنا سمجھ کر وہ سب کچھ دیا جو وہ دے سکتے تھے، ریاست کے امن و امان اور ملک کے اتحاد کی خاطر انھوں نے ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہی طرح کا نظام حکومت رائج کر دیا۔ اس مشترک نظام حکومت کی وجہ سے اہل ملک کی تہذیب، معاشرت اور صنعت میں یکسانی پیدا ہو گئی۔

مسلمان ایک مکمل تہذیب اور معاشرت اپنے ساتھ لائے تھے، انھوں نے اپنی تہذیب کو یہاں کی تہذیب سے ملنے کا موقع دیا جس کی وجہ سے یہاں کے مذہب و معاشرت اور علوم و فنون نے جو شکل اختیار کی وہ خالص ملکی شکل تھی، مسلمان صوفیوں اور ہندو جوگیوں کے اتحاد نے مذہب میں جو یکسانی پیدا کی اس کی مثال کبیر، نانک، چیتنیہ اور گیان دیو کے وہ مذہبی سلسلے ہیں جن میں مسلمان صوفیہ کے اصول و عقائد نمایاں ہیں۔ ان نئی مذہبی تحریکوں کا باعث مسلمان صوفیوں کی وہ تعلیم تھی جو اسلامی رواداری، مساوات، حسن اخلاق، خدا پرستی اور تزکیۂ نفس کے عقائد پر مبنی [illegible]

طرح معاشرت نے دونوں کے میل جول سے ایک نئی صورت اختیار کی۔ مسلمانوں کے طور طریقے۔ رہن سہن رسم و رواج اور اخلاق و عادات ہندو معاشرت کے جز بن گئے یہاں تک کہ دونوں کی خانگی زندگی میں بھی بہت کچھ یکسانی پیدا ہو گئی، ہندو گھرانوں میں گفتگو کے وہی آداب رائج ہو گئے جو مسلمانوں کے یہاں تھے۔ وہی لباس، برتن، زیور اور اسلحہ استعمال ہونے لگے، جو مسلمان اپنے ساتھ لائے تھے۔

فارسی زبان مسلمان اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہاں آکر انھوں نے ہندی اور دوسری زبانیں سیکھیں بہت سی سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا، اور ہندی، بنگالی اور پنجابی ادب میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ خود مسلمان شعراء نے ان زبانوں میں شاعری کی، لیکن قومی اتحاد کی سب سے بڑی مثال اردو زبان ہے جو اس زمانہ میں ملک کی تمام بھاشاؤں سے مل کر بنی یہی زبان روزمرہ کی بول چال کی زبان ہوئی، اس میں مسلمان مصنفین نے ہندوؤں کے قصے کہانیاں کہیں اور اس طرح اس کے ادب کی داغ بیل پڑی۔ فنون لطیفہ نے بھی اس عہد میں اسی طرح چولا بدلا، عہد وسطیٰ کے آخری دور کی عمارتیں ہندو مسلم فن تعمیر کی آمیزش کا نمونہ ہیں۔ گنبد اور محرابوں کا رواج اسی زمانہ میں ہوا، نئے نئے طرز کے نقش و نگار، سنگ تراشی اور پچی کاری نے رواج پایا۔ فن مصوری میں بھی ایرانی اور تورانی مذاق کا اجنتا کے قدیم مذاق کے ساتھ امتزاج ہوا۔

عہد وسطیٰ کی اس تہذیب نے ہندوستانیوں کے رسم و رواج،

طرزِ معاشرت، ادب اور آرٹ میں بہت کچھ یکسانی پیدا کر دی تھی، اور اس لئے اُن میں قومیت کا جذبہ اُبھرنے لگا تھا دورِ جدید میں ایسے اسباب کا اضافہ ہوا جس سے یہ جذبہ پورے طور پر بروئے کار آنے لگا، اٹھارویں صدی میں مغلوں کے بعد ہندوستان میں ایک نئی تہذیب کا دور شروع ہوا یہ یورپی تہذیب تھی، پرانی اور نئی تہذیب کے تصادم کی وجہ سے تقریباً ایک صدی تک اہلِ ہند پر ایک عام افسردگی اور جمود طاری رہا۔ سیاست میں انقلاب ہو رہا تھا، پرانی بساط اُٹھ رہی تھی، پرانے ادارے مٹ رہے تھے، پرانے خیالات اور پرانی تہذیب کی جگہ نئے خیالات اور نئی تہذیب آ رہی تھی، حکومت کے ساتھ ساتھ ان کی دولت اور تعلیم بھی جا چکی تھی، غلامی کی ذلّت نے اخلاق پست کر دئے تھے۔ ان کی قومی حمیت اور خودداری مٹ گئی تھی ذاتی اغراض کی خاطر قومی اور ملکی مفاد کو قربان کر دینا معمولی بات ہو گئی تھی ان میں جہالت، توہم پرستی اور رسم و رواج کی اندھی تقلید کا دور دورہ تھا۔

۷ مغربی تعلیم اور تہذیب سے متاثر ہو کر ہندوستانیوں میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی جس نے مذہب و معاشرت کی اصلاح کی طرف قدم بڑھایا۔ ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے، دیوندر ناتھ ٹیگور، کیشب چندر سین، سوامی دیانند اور مسلمانوں میں مولانا شاہ عبدالعزیزؒ، مولانا شاہ ولی اللہؒ، مولوی سید احمد رائے بریلوی، مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی چراغ علی، سر سید احمد خاں، شبلی نعمانی اور خواجہ الطاف حسین حالی وہ شخصیتیں ہیں جنھوں نے

اپنی اپنی قوم میں مذہبی اور معاشرتی اصلاح کی کوشش کی اور آزادی کے ولولے پیدا کئے، تعلیمی ترقی نے ہندوستانیوں میں بھی یہ خواہش پیدا کردی کہ وہ اپنی زندگی اور تنظیم عقلی اصولوں پر کریں، اور ان تمام قیود اور بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش کریں جو ان کی زندگی کی آزادانہ نشوونما میں حائل ہیں مذہبی اور معاشرتی آزادی کے ساتھ ساتھ سیاسی آزادی کی خواہش بھی عام ہونے لگی۔

قومی بیداری کا سب سے پہلا اظہار مسلمانوں کی طرف سے ہوا۔ تیرھویں صدی میں ایک طرف تو اُن کی سیاسی طاقت فنا ہورہی تھی اور دوسری طرف مذہبی زبوں حالی حد سے گذر چکی تھی۔ چنانچہ مولٰنا محمد اسمٰعیل دہلوی اور مولٰنا سید احمد رائے بریلوی نے تجدید دین کی نئی تحریک شروع کی۔ اس وقت پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم تھی اور وہاں کے مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم حد سے گزر چکے تھے۔ چنانچہ ان دونوں بزرگوں نے مسلمانوں کو سکھوں کے خلاف جہاد کی دعوت دی جس کی آواز ہندوستان کے طول وعرض میں یکساں پھیل گئی اور مسلمان جوق جوق ان کے علم کے نیچے جمع ہونے لگے۔ سنہ ۱۸۲۶ء میں مسلمانوں کا سکھوں سے مقابلہ ہوا، چار سال جہاد جاری رہا اور تقریباً سارا پنجاب مسلمانوں کے قبضے میں آگیا لیکن سنہ ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے معرکہ میں مولٰنا محمد اسمٰعیل اور مولٰنا سید احمد دونوں شہید ہوئے اور پنجاب پر دوبارہ سکھوں کا تسلط ہوگیا۔ گو وقتی طور پر یہ تحریک ناکامیاب ہوئی مگر اس نے مسلمانوں میں خلوص، اتحاد، سیاست اور تنظیم کے جو اثرات چھوڑے

وہ مٹنے والے نہ تھے[1]

دورِ جدید میں ہندوستان میں قومی جذبہ کے اُبھارنے میں ملک کے اقتصادی حالات کو بھی بہت دخل ہے۔ سفر کے وسائل اور خبر رسانی کے ذرائع میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے ملک کا ایک حصہ دوسرے حصے سے قریب تر ہو گیا ہے، ملک کے زراعتی، تجارتی اور صنعتی حالات ہر جگہ قریب قریب یکساں ہیں۔ اسی وجہ سے اہلِ ملک کے اقتصادی اغراض و مقاصد مشترک ہو گئے ہیں۔ یہ اقتصادی وحدت ہی دنیا میں جدید قومیت کی بنیاد ہے۔ برطانوی نظامِ حکومت کی یکسانی اور سیاسی قوت کی مرکزیت نے بھی اس ملک کے تمام باشندوں کو ایک جماعت بنا دیا ہے۔ حکومت کی جدو جہد زندگی کے ہر شعبے میں بڑھ گئی ہے اور رعایا کے رنج و راحت کا انحصار تمامتر حکومت کے طرزِ عمل پر ہے، لیکن حکومت نے گزشتہ ڈیڑھ سو برس میں جو طرزِ عمل اختیار کیا اُس سے امن و امان اور ترقیوں کے باوجود ملک میں فقر و فاقہ، جہالت، بیماری اور غلامی کی ذلتیں بدستور رہیں۔ اس لئے حکومت ایک ایسا بوجھ بن گئی جو ملک والوں کی برداشت سے باہر تھا، اور وہ اس سے آزاد ہونا چاہتے تھے، ہندو اور مسلمان دونوں کی طرف سے آزادی کی اس خواہش کا اظہار ۱۸۵۷ء کی اُس کوشش میں ہوا جسے

---

[1] مولانا سید احمد رائے بریلوی کی تحریک کے حالات کے لئے "سیرت سید احمد شہید" مؤلفہ سید ابوالحسن ندوی جو نامی پریس لکھنؤ سے مارچ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی ہے ملاحظہ ہو۔

ہنگامہ غدر کہا جاتا ہے، اگرچہ اپنے غیر منظم ہونے کی وجہ سے یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی مگر قومی آزادی کے جذبات بدستور نشو نما پاتے رہے، ان جذبات کو انگریزی عہد کی تعلیم، مغربی ادب، یورپی ملکوں کی تاریخ نے اور بھی بڑھا دیا۔ تعلیم یافتہ طبقہ کے دلوں میں قومی خودداری اور ملکی آزادی کا جوش بڑھتا رہا یہاں تک کہ اسی جماعت نے ۱۸۸۴ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی جو حکومت کے سامنے باقاعدہ طور پر اپنے دعوے پیش کرنے لگی۔ مسلمان بحیثیت قوم کے ابتداءً سیاست سے علیحدہ رہے لیکن ۱۹۰۶ء میں انھوں نے بھی مسلم لیگ قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے کیونکہ وہ ایک مستقل اقلیت ہیں اور اکثریت سے اُن کا مفاد جداگانہ ہے۔

جنگ عظیم کے زمانہ میں جس طرح دنیا کی دوسری محکوم قوموں نے آزادی کی توقعات قائم کرلی تھیں ہندوستانی بھی آزاد ہونے کے خواب دیکھنے لگے، چنانچہ ہندو مسلمان آپس میں اتحاد کرنے کے لئے تیار ہوگئے، اور ۱۹۱۶ء میں دونوں کے درمیان لکھنؤ کا وہ سمجھوتہ ہوا جسے "کانگریس لیگ سمجھوتہ" کہتے ہیں ۱۹۲۱ء کی تحریک عدم تعاون کے زمانے میں ملک کی آزادی کے لئے دونوں دوش بدوش کوشش کرنے لگے لیکن یہ اتحاد زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان اختلافات رونما ہونے لگے اور پانچ چھ سال بعد مسلمان بحیثیت قوم کے کانگریس سے علیحدہ ہوگئے اور اپنی جداگانہ تنظیم کرنے لگے، چند سال سے مسلم لیگ کو مسلمانوں میں عام مقبولیت حاصل ہوگئی ہے اور وہ جناب محمد علی جناح کے زیر قیادت مسلمانوں کی سیاسی اور معاشرتی تنظیم میں مصروف ہے، بیرونی حکومت سے آزادی حاصل کرنا اُن کا بھی نصب العین ہے۔ ا د

اسلامی تعلیم اور قومیت کا تصوّر

اسلام نے دنیا کے سامنے قومیت کا ایک بالکل جدید تخیل پیش کیا۔ اُس نے تمام بنی نوعِ انسان کو خدا کی طاعت و بندگی، نفس کی طہارت و پاکیزگی اور عمل کی نیکی و پرہیزگاری کی دعوت دی تھی۔ اس لئے اُس نے انسانوں کے مابین یکجہتی کا ذریعہ قانونِ الٰہی کا اتباع قرار دیا اور اسی کو انسانوں کے اتحاد کا ضامن ٹھہرایا۔ خداپرستی اور نکوکاری کی دعوت قبول کرنے والے ایک اُمت قرار دیئے گئے، اس اُمت کے لئے جو حکم آیا وہ یہ تھا کہ "تم سب اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لو"[1] اور اس کو جو تعلیم دی گئی وہ یہ تھی کہ "ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل بنا دیا۔ تاکہ آپس میں پہچانے جاؤ، مگر درحقیقت معزز تم میں وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے"[2] قبائل کی تقسیم کا مقصد محض یہ رہ گیا کہ ایک کو دوسرے سے پہچانا جاسکے ورنہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان جو اصل فرق ہے وہ کردار کا ہے نہ کہ حسب و نسب کا۔ اسی طرح یہ حکم دے کر کہ "مسلمان آپس میں بھائی

---

[1] وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا (آلِ عمران - ۱۱)

[2] يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات : ۲)

بھائی ہیں[1]" رنگ، وطن، زبان، معشیت اور سیاست کے امتیازات کو یک قلم مسترد کر دیا اور مسلمان کو خواہ وہ چین میں رہتا ہو یا مراقش میں، اردو بولتا ہو یا عربی، سامی نسل سے ہو یا آریائی، ایک نظام کی حکومت سے تعلق رکھتا ہو یا دوسرے سے، ایک ہی رشتۂ اخوت میں منسلک کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان پارسی، بلال حبشی، صہیب رومی اسلام کی صفِ اوّل میں نظر آتے ہیں۔ جب مکہ کے مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو خود پیغمبر اسلام علیہ الصلواۃ والسلام نے مدینہ والوں کو یہ اصول بتایا کہ مہاجرین اور انصار دونوں اسلامی اخوت میں منسلک ہونے کی وجہ سے ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔

رسول اللہ صلعم کا اپنے وطن مکہ کو چھوڑتے وقت یہ فرمانا کہ "اے مکہ تو مجھ کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے مگر کیا کروں کہ تیرے فرزند مجھے تیری آغوش سے جدا کرتے ہیں" بتاتا ہے کہ اسلام حب وطن کو تسلیم تو کرتا ہے مگر اس کے نزدیک یہ جذبہ اتنا معمولی ہے کہ اس کو نبی نوع انسان کی اجتماعی وحدت کی بنیاد نہیں قرار دیا جا سکتا۔ دین کا اتحاد ان سب علائق پر غالب آسکتا ہے اور یہ وحدت تمام نبی نوع انسانی کو اپنے دائرے میں سمیٹ سکتی ہے۔ اسلام کی تاریخ ہمارے سامنے اس کی عملی مثال پیش کرتی ہے۔ اسلامی تہذیب کی نشو و نما تمام تر عرب سے

---

[1] اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ

باہر ہوئی۔ سولھویں صدی کے آغاز تک تقریباً ایک ہزار برس مسلمان ملک
گیریوں اور جہاں کشائیوں میں مصروف رہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت
میں مصر، شام، ایران اور عراق اسلامی قلمرو میں شامل ہو چکے تھے،
اور بنی اُمیّہ کے ابتدائی عہد میں دریائے سندھ سے کوہ پرانس
(Pyrenees) تک تمام ملک اسلامی خلافت کا جزو بن گئے
تھے۔ اس وسیع سلطنت کے مختلف تہذیبی عناصر آپس میں اس طرح
مدغم ہوئے کہ اُن کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنا مشکل ہو گیا۔ اسلامی
دنیا نے علم و حکمت کے قدیم خزانوں کی تلاش کی اور اُن پر اپنی طرف
سے معتد بہ اضافہ کر کے دنیا کو ایک عدیم النظیر لٹریچر سے روشناس کرایا۔
ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں نے ایک ایسے جامع نظام عدل کی تدوین کی
جس کو بجا طور پر اسلامی تمدن کا سب سے گرانمایہ ترکہ قرار دیا جا سکتا ہے
اسلامی تہذیب و شائستگی کی یہ یکرنگی درحقیقت مسلمانوں کی متفقہ عقلی تحریک
کا ماحصل ہے اس لئے ہر مسلمان کے لئے لازمی قرار دیا گیا کہ جماعتی زندگی
میں شریک ہونے کے لئے وہ ایک طرف تو ارکان و قوانین اسلام کی
پابندی کرے اور دوسری طرف اپنے آپ کو اسلامی تہذیب کے رنگ
میں رنگے۔ ڈاکٹر اقبال اپنے ایک مضمون میں اسلام کے اس تخیل کے متعلق
اپنا نظریہ مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

اسلامی ملت کا زندہ رکن بننے کے لئے انسان کو مذہب اسلام پر
بلا شرط ایمان لانے کے علاوہ اسلامی تہذیب کے رنگ میں اپنے تئیں

پوری طرح سے رنگنا چاہیئے۔ "صبغۃ اللہ" کے اس خم میں غوطہ لگانے کا مدعا یہ ہے کہ مسلمان دورنگی چھوڑ کر یک رنگ ہو جائیں، ان کا ذہنی منظر ایک ہو، وہ مظاہر آفرینش پر ایک خاص پہلو سے نظر ڈالیں، اشیاء کی ماہیت اور قدر و قیمت کو اس انداز خاص کے ساتھ جانچیں جو جماعت اسلامی اور دوسری جماعتوں کا مابہ الامتیاز ہے اور جو مسلمانوں کو ایک غایت محققہ و مقصد معینہ کے پیرایئے سے آراستہ کر کے انھیں "رحمتِ کلّ مومنٍ اخوۃ" کی کتاب کے اوراق بنا دیتا ہے۔" اسی مضمون میں اقبال مرحوم ایک دوسری جگہ کہتے ہیں کہ:-

"اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا جب تک کہ ہم اصول اسلام سے پوری طرح واقف نہ ہوں بالفاظ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں خدا کی رسی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔"

تحریک اتحاد اسلامی

اسلامی اخوت کا تخیل اسلامی دنیا میں کوئی نیا تخیل نہ تھا۔ اسی کی

تجدید نے انیسویں صدی کے اواخر میں "تحریک اتحاد اسلامی" کی شکل اختیار کی جسے یورپ میں "عالمگیر اسلامیت" یا "پان اسلامزم" کا لقب دیا جاتا ہے، اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں اتحاد ملت قایم کیا جائے اور یورپی قوتوں کی ان معاندانہ کوششوں کا جو ترکوں کے خلاف یورپ میں ہو رہی تھیں مقابلہ کر کے ترکی خلافت کو اغیار کی دست برد سے بچایا جائے۔ ان پیہم صدمات نے اخوت اور مساوات کا بھولا ہوا سبق ان کو ایک بار پھر یاد دلایا اور ایک نئی زندگی کی تعمیر کے لئے وہ متحدہ کوششیں کرنے پر آمادہ ہو گئے، عین اس حالت میں کہ مسلمانوں کی قوت عمل اس طرح بیدار ہو چکی تھی مرکز خلافت سے تحریک "اتحاد اسلامی" کی صدا اٹھی۔ انھوں نے خلافت کے ساتھ اپنے رشتہ کو جوڑنے کی از سر نو کوشش کی اور دیکھتے دیکھتے یہ تحریک تمام عالم اسلامی میں پھیل گئی۔ اس تحریک کے سب سے بڑے علمبردار سید جمال الدین افغانی تھے جنھوں نے اپنی تعلیمات سے مصر، ترکی اور کل دنیائے اسلام میں تازہ جوش پیدا کر دیا اور اپنے رسالہ "العروۃ الوثقیٰ" کے ذریعہ اس تحریک کو اسلامی دنیا میں بین الاقوامی شکل دے دی۔ تحریک کی مقبولیت اس حد تک پہنچی کہ یورپی حکومتیں مسلمانوں کی اس نشأۃ ثانیہ کو اپنے لئے خطرہ سمجھنے لگیں سلطان عبدالحمید کا دارالخلافت قسطنطنیہ ہر ملک کے وقیع اور مشاہیر علماء اور مدبرین کا مرکز تھا۔ اور ہر اسلامی ملک میں تحریک کی نشر و اشاعت ہو رہی تھی۔ حجاز ریلوے کے لئے سلطان ترکی کی طرف سے چندے کی اپیل ہوئی اور اس سلسلہ میں

تمام اسلامی ممالک سے تعلقات قائم کئے گئے۔ ہانس کوہن اپنی کتاب "نیشنلزم ان دی ایسٹ" میں کہتا ہے کہ "چودھویں صدی ہجری میں مسلمانوں میں جذبۂ اتحاد کی جو مثال ملتی ہے وہ دوسری صدی ہجری کے بعد اسلامی تاریخ میں شاید ہی کہیں ملے" اپنے ابتدائی دور ہی میں تحریک کو کسی قدر کامیابی بھی نصیب ہوئی، ۱۹۰۸ء میں آسٹریا ہنگری اور ترکی کے درمیان جو صلحنامہ ہوا اس میں یہ طے پایا کہ بوسنیا کا ملک آسٹریا ہنگری کے قبضہ میں رہے گا لیکن وہاں جمعہ میں سلطان ترکی کا خطبہ پڑھا جائے گا اور باب عالی ہی سے بوسنیا کا قاضی بھی مقرر ہوگا۔ اس قسم کا ایک معاہدہ ۱۹۱۲ء میں لیبیا کے متعلق اطالیہ سے ہوا، ۱۹۱۳ء میں یونان اور بلغاریہ سے جو معاہدے ہوئے ان کی رو سے بھی سلطان ترکی کو ان ملکوں میں یہی حقوق حاصل رہے۔ صلحناموں کی ان شرائط کا صاف مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی وحدت کو کسی نہ کسی شکل میں قائم رکھا جائے چنانچہ ان جنگوں میں جو ترکی کو یورپ میں لڑنا پڑیں عالم اسلامی کی ہمدردی ترکوں کے ساتھ رہی۔ بہت سے ملکوں نے مریضوں کی مرہم پٹی کے لئے "ہلال احمر" (Red Crescent Society) کو چندے دئے جنگ بلقان میں اڈریانوپل کی فتح کے وقت تمام اسلامی دنیا میں خوشی منائی گئی، اسی طرح جب اطالیہ نے طرابلس پر حملہ کیا تو طرابلسی عرب اور سنوسی دونوں جماعتیں جو اب تک ترکوں سے برگشتہ تھیں ترکوں کے ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہوگئیں، طرابلس کی جنگ میں اطالیہ کا صرف ترکوں ہی سے مقابلہ نہ تھا بلکہ

تمام اسلامی دنیا کی مخالفت کا سامنا تھا۔
۱۹۱۳ء میں ہمارے ملک میں "انجمن خدام کعبہ" کی بنیاد پڑی جس کا مقصد حرمین شریفین اور بیت المقدس کو اغیار کے قبضے سے محفوظ رکھنا تھا۔ جن لوگوں نے اس زمانے کے "الہلال" اور "ہمدرد" کے مضامین دیکھے ہوں گے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مولٰنا ابوالکلام آزاد اور مولٰنا محمد علی مرحوم کی کوششوں نے اس زمانہ میں ہندوستانی مسلمانوں میں سیاسی اور مذہبی بیداری پیدا کرنے میں کتنا بڑا حصہ لیا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان میں تحریک خلافت کے بھی یہی لوگ علمبردار تھے، اور اس تحریک کو بھی اس ملک میں جو کامیابی نصیب ہوئی وہ ہندوستانی مسلمانوں کے ملی احساس کا نتیجہ تھی، ادھر تو اسلامی دنیا میں اتحاد و ارتباط کی یہ لہر دوڑ رہی تھی ادھر ۳ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ترکی کی جمعیت وطنی نے خلیفہ کو معزول کر کے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔
ترکی خلافت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد بظاہر اتحاد اسلامی کی تحریک بیجان ہو گئی لیکن اسی کے اثرات مختلف اسلامی ممالک میں الگ الگ قومی جدوجہد کا باعث ہیں۔ عربی ملکوں کی موجودہ تحریک "اتحاد عرب" بھی اسی تحریک کی ایک صدائے بازگشت ہے، عراق اور ایران کی مملکتوں کے اندر شیعوں اور سنیوں کی آپس کی نفرت روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ دوسری آزاد اسلامی مملکتوں نے بھی ارتباط اور اتحاد کی اہمیت کو سمجھ لیا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے حدود کے اندر ملت کے

اتحادِ عمل کی کوشش کر رہی ہیں بلکہ دوسری آزاد اسلامی مملکتوں سے بھی اتحاد کر رہی ہیں۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی افغانستان، ایران، عراق اور ترکی کا وہ اتحاد ہے جو اب سے چند سال قبل ہوا اور جس کو میثاق سعد آباد کہا جاتا ہے۔

مصر کی قومی تحریک

انیسویں صدی میں مشرقی ممالک کی بیداری درحقیقت یورپی سیلاب کے خلاف ایک ردّعمل تھا۔ مشرق قریب یورپ سے سب سے زیادہ متاثر ہوا، اس لئے ان میں یورپ کی طرز کی سیاسی جدوجہد شروع ہوئی، اور مصر اس میں پیش پیش تھا۔ یہی ملک سب سے پہلے یورپ کی تہذیب حاضر سے دوچار بھی ہوا تھا، انقلاب فرانس کے اثرات نے اس ملک کی ذہنیت میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ ۱۷۹۸ء میں جمہوریہ فرانس کی طرف سے نپولین بوناپارٹ مصر کو فتح کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا تاکہ ہندوستان کے ساتھ انگریزی تجارت کو روک دے۔ چنانچہ اس نے قاہرہ پہ قبضہ کر لیا، وہ خود مصر میں زیادہ ٹھیر نہ سکا اور اس کے جانشینوں کو پانچ ہی سال بعد انگریزوں نے مصر سے نکال دیا۔ لیکن فرانسیسی تسلط کے یہ چند سال مصریوں کی ذہنیت میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر گئے۔ انقلاب فرانس نے یورپ میں آزادی اور مساوات کا علم بلند کیا تھا وہ جن ملکوں میں جاتے تھے وہاں انقلابی ذہنیت کا پیدا ہو جانا لازمی تھا۔ مصر کے

انتظام حکومت میں تو انھیں خود دخل تھا چنانچہ اس ملک میں انھوں نے اصلاحیں کیں اور عوام کو نمایندوں کے ذریعے حکومت میں حصہ لینے کا اختیار دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مصر کی قدیم تاریخی عظمت کو بھی زندہ کیا۔ نپولین فرانس کے بہت سے منتخب عالموں کو اپنے ساتھ لایا تھا اور ایک ادارہ مخصوص اس غرض سے قائم کیا تھا کہ قدیم مصر کی تاریخ کا پتہ چلایا جائے آثرات کی تحقیق کی طرف مصر نے پہلا قدم اسی زمانہ میں اٹھایا۔ اور عہد ماضی کی مدفون، عظمت ایک بار پھر مصریوں کی نظروں کے سامنے آگئی، اسی طرح قدیم مصری علوم و فنون کا سراغ لگایا گیا، یہی چیزیں انیسویں صدی میں مصریوں میں قومی احساس کو بیدار کرنے کا باعث ہوئیں، مصر میں محمد علی پاشا کی حکومت نے بھی قومیت کے احساس کو استوار کرنے میں بہت مدد دی۔ اس نے ۱۸۳۱ء میں دولت عثمانیہ کے اثر سے ایک حد تک آزاد ہو کر مصری فوج اور مصری بیڑہ تیار کیا، مصر کی کاشتکار آبادی کی اقتصادی حالت درست کرنے کے لئے ہر امکانی کوشش کی، مصر میں نہریں کھدوائیں مدرسے کھلوائے، یورپ سے عالموں کو اپنے یہاں بلایا اور اپنے طلبہ کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ بھیجا، اس کے جانشینوں نے بھی اس کی روش پر چلنے کی کوشش کی۔ لیکن اسمٰعیل پاشا کے عہد میں حکومت کے کثیر مصارف کا بار سلطنت اُٹھا نہیں سکتی تھی، اس لئے اُس نے فرانس اور انگلستان سے قرضے لئے، نتیجہ یہ ہوا کہ مصر پھر انھیں دو طاقتوں کے زیر اثر آگیا جن کا عرصے سے اس

ملک پر دانت تھا، انھوں نے مصر کی مالیات پر نگرانی شروع کر دی ساتھ ہی ساتھ مصر کے اندرونی معاملات میں بھی مداخلت کرنے لگیں۔ اسی مداخلت کی وجہ سے مصر میں عرابی پاشا کی تحریک وجود میں آئی، یہ مصر کی پہلی قومی تحریک تھی، جس نے مصر کی فلاحین میں بیداری پیدا کی اور انھوں نے نہ صرف یورپی مداخلت کے خلاف آواز اٹھائی بلکہ ملک کے اس حکمران طبقہ کی بھی مخالفت کی جس کی حکومت مصریوں کے لئے تباہی کا باعث ہوئی تھی، فلاحین مصر کی اس قومی تحریک کو جامعۂ ازہر کی اس تحریک اصلاح سے بہت مدد ملی جو سید جمال الدین افغانی کی کوششوں سے مصر میں پیدا ہوئی تھی، اور جس نے مصر کے تعلیم یافتہ طبقے میں ایک عام بیداری پیدا کر دی تھی۔ یورپی طاقتوں کی طرف سے مصری قومیت کو دبانے کی کوشش برابر جاری رہی، ۱۸۸۲ء میں عرابی پاشا کو شکست ہوئی اور اسے جلاوطن کیا گیا اس طرح انگریز مصر پر قابض ہو گئے، لیکن اس تشدد کی وجہ سے قومی جذبہ میں اور زیادہ ترقی ہوئی۔ عرابی پاشا نے جس کام کو شروع کیا تھا وہ برابر جاری رہا اور مصری قومیت اپنے ارتقائی منازل طے کرتی رہی، مصطفےٰ کامل پاشا اور سعد زغلول پاشا کی کوششیں بالآخر کامیاب ہوئیں۔ اور ۱۹۲۲ء میں مصر کی "آزادی" کا برطانیہ نے اعلان کر دیا۔ یہ "آزادی" گو کسی طرح آزادی کے صحیح مفہوم کو ادا نہیں کرتی لیکن مصری قوم پرستوں کی جدوجہد برابر جاری ہے اور ان کا نصب العین اپنے ملک میں قومی آزاد حکومت قائم کرنا ہے۔

اسلامی ممالک

انیسویں صدی تک مشرق قریب کے اسلامی ممالک میں عہد وسطیٰ کا نظام معاشرت قائم رہا۔ ایران کو چھوڑ کر یہ تمام ممالک سیاسی حیثیت سے ترکی سلطنت میں شامل تھے، اور مشترکہ نظام حکومت اور مذہبی اشتراک کی وجہ سے باہم گربستہ و پیوستہ تھے، سیاسی اور مذہبی یکسانیت کے ساتھ ساتھ ان ملکوں کی اقتصادی ضروریات اور معاشی اغراض بھی بڑی حد تک ایک ہی طرح کی تھیں، ان تمام خصوصیات کی وجہ سے ترکی سلطنت کے مختلف عناصر ایک ہی رشتہ میں منسلک رہے۔ عہد وسطیٰ کے نظام معاشرت میں مذہب کو جو اہمیت حاصل تھی اس کی وجہ سے ان ملکوں کے معاشرتی ادارے، قوانین، تعلیم اور ذہنی کیفیات میں یکسانیت پیدا ہو گئی تھی، اور وہ ایک حد تک تہذیبی قومیت بن گئے تھے۔

اسلامی ملکوں کا یہ اتحاد صدیوں تک قائم رہا لیکن انیسویں صدی سے ان ملکوں میں بھی جدا جدا قومی تحریکیں شروع ہونے لگیں۔ ان تحریکوں کے پیدا ہونے کی بھی وہی اسباب ہوئے جن کے ماتحت مشرق کے دوسرے ملکوں میں قومی تحریکیں وجود میں آئیں۔ ترکی، مصر اور شام کے ممالک یورپ سے قرب اور ان ملکوں میں مغربی خیالات کی ترویج ہی ان کی جدا جدا قومیت کا باعث ہوئی ہے۔ ان ملکوں کی قومیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں یورپی سیاست کے "مسئلہ شرقیہ" اور ترکی خلافت کی " تحریک اتحاد اسلامی " سے آن

واقعات پر دوبارہ نظر ڈال لینی چاہیئے جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے،
انیسویں صدی میں مغربی قومیت کا تصور مشرق کے دماغوں پر بہت تیزی کے
ساتھ قابو پا رہا تھا۔ مغربی سرمایہ داری اور تجارت کی وجہ سے مشرقی ملکوں
کے اقتصادی حالات سرعت کے ساتھ بدل رہے تھے، مغربی تعلیم کو
اہلِ یورپ اور خود مشرقی حکومتیں زیادہ سے زیادہ رواج دینے میں مصروف
تھیں، چنانچہ مشرق کے تعلیم یافتہ طبقے میں وکلاء، مدرسین اور اخبار نویسوں
کی ایسی جماعتیں پیدا ہونے لگیں جن کے دماغ مغربی قومیت کے تخیل سے
پوری طرح متاثر تھے۔ قومی جذبہ کا سب سے پہلا اظہار مصر میں ہوا مصر کو
نے ترکوں کی حکومت اور اہلِ یورپ کے اثر و اقتدار سے آزاد ہونے کے لئے
۱۸۸۲ء میں جو کوشش کی وہ ان مغربی خیالات ہی کا نتیجہ تھی جو اہلِ مصر
کی ذہنیت پر چھاتے جا رہے تھے۔ شام اور عراق میں قومیت کے جذبات
اس وقت عام ہوئے جب ۱۹۰۸ء میں ترکی میں انجمن اتحاد ترقی کو کامیابی
حاصل ہوئی۔ ترکی وطنیت نے ترکوں کی عرب رعایا کی قومیت کو تحریک دی
اس کے بعد جب ۱۹۱۹ء میں ان ملکوں میں ترکی حکومت کی جگہ یورپی حکومتیں
قائم ہوئیں تو ان میں قومیت کا جذبہ اور بھی زیادہ ہو گیا۔ ان میں سے ہر ملک
اپنی آزادی کے لئے اپنی اپنی سیاسی تنظیم کرنے لگا۔ آج کل ممالک
عرب میں مصری، شامی، عراقی، اور عربی قومیتیں بالکل جدا جدا حیثیت رکھتی
ہیں، اس جداگانہ وطنی قومیت کے پیدا کرنے میں یورپی سیاست نے جو حصہ
لیا ہے اس کی تازہ ترین مثال فلسطین کی قومیت ہے جہاں عربی بولنے

والے عیسائی اور مسلمان ایک قوم قرار دیئے گئے ہیں اور عبرانی بولنے والے یہودی دوسری قوم۔ شام، عراق اور عرب میں اگرچہ قومیت کا آغاز ہو چکا ہے لیکن ان ملکوں میں ابھی بہت سے ایسے عناصر موجود ہیں جو عوام کی بیداری میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں، اور جن کی وجہ سے قومیت ان کے دل و دماغ پر پورا تسلط نہیں کر سکی ہے، مثلاً عرب میں اندرونی اتحاد مفقود ہے، اس ملک میں عام طور پر قبائلی سرداروں کے ساتھ وفاداری کے جذبات موجود ہیں، عوام کی جہالت اور افلاس اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے نامساعد جغرافی حالات ایسی رکاوٹیں بنے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے قومی تحریکیں عمومی حیثیت اختیار نہیں کر سکیں ہیں۔ کم و بیش یہی حالت دوسرے عربی ملکوں کی ہے۔ ان کے عوام میں بھی جدید خیالات ابھی اس ترقی کو نہیں پہنچے ہیں کہ وہ اپنے باہمی اختلافات کو مٹا کر مضبوط قومی حکومت قائم کر سکیں، ان ملکوں میں قومیت کی علمبردار بالعموم وہ جماعتیں ہیں جنھیں ملک میں سیاسی قوت حاصل ہے اور جن کے ہاتھوں میں فوج اور ملک کا انتظام حکومت ہے۔ ابتداءً ان جماعتوں نے عراق اور مصر میں بیرونی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے عوام کو اپنے ساتھ لیا لیکن باوجودیکہ ان کے مطالبات پورے نہ کئے گئے یہ عوام کو کسی مستحکم قومیت میں متحد نہ کر سکے۔ بہر حال ان کی موجودہ قومیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ وہی مغربی طرز کی اقتصادی قومیت ہے جس سے مخصوص جماعتیں ہی فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ خود ان ملکوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ اس وطنی قومیت کی بنیادیں محض تنگ نظری پر قائم ہوئی ہیں۔ اور اس کا

مطمع نظر ذاتی اغراض کے حصول کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کے برخلاف وہ متحدہ قومیت جسے وہ اپنے مذہبی اور نسلی اشتراکات پر قائم کرسکتے ہیں کہیں زیادہ مفید ہوسکتی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ اتحاد عرب کا یہ خیال صرف آرزو ہی کی حد تک رہے گا یا اس سلسلہ میں عربی ممالک کی طرف سے کوئی عملی قدم بھی اٹھایا جائے گا۔ درحقیقت ان ملکوں کے مستقبل کا دارومدار اس وقت ان کے اسی فیصلہ پر ہے کہ ان کو علیحدہ علیحدہ قومیتوں میں منقسم رہنا چاہیئے یا کل ممالک عربیہ میں ایک متحدہ قومیت قائم کرنا چاہیئے۔ ترکی اور ایران کی موجودہ قومیت عربی ممالک کی قومیت سے مختلف ہے۔ یہ دونوں ملک آزاد ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر تہذیبی وحدت ہیں، ایران نے تو اپنی قومی وحدت کو مکمل کرنے کے لئے اپنے مذہب کو بھی قومیت ہی کا رنگ دے لیا ہے حال ہی میں حکومت ایران کی طرف سے شیعہ سنی کی تفریق قانوناً ممنوع قرار دی گئی ہے، اور یہ احکام جاری کردئے گئے ہیں کہ کوئی ایرانی اپنے آپ کو شیعہ یا سنی نہ لکھے، ترکی اور ایرانی دونوں ملکوں میں قومی جذبات کافی عرصہ تک نشوونما پانے کے بعد اپنی انتہا کو پہنچے ہیں۔ ان دونوں نے اپنے آپ کو بیرونی طاقتوں اور غیر ملکی اثرات سے آزاد رکھنے کے لئے جو کوششیں کیں ان سے ان کی قومیت کو بہت مدد ملی ہے۔ ترکوں نے اپنی سیاسی جدوجہد میں خالص یورپی طرز اختیار کیا، اور ان میں قومیت کا جذبہ اتنا شدید ہوگیا ہے کہ انھوں نے اپنے ملک میں غیر قومی اقلیتوں کو بھی باقی نہ رکھا ہے، چنانچہ انھوں نے جمہوریہ ترکیہ کے تمام یونانیوں کو یونان کے تمام ترکوں سے تبدیل

کر لیا اسی طرح ارمنوں کو اپنی آبادی سے خارج کر کے اور کردوں کو دبا کر ترکی کو خالص ترکوں کی جمہوریت بنا لیا۔ ترکی قومیت میں اس شدت کے پیدا کرنے کا باعث وہ بیرونی خطرات بھی تھے جو ترکی جمہوریہ کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھے، اور جن کی وجہ سے ترکوں کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے تحفظ اور بقاء کی خاطر تمام اُن عناصر کو جن کی طرف سے ذرا بھی اندیشہ ہو سکتا تھا اپنے ملک سے خارج کر کے ایسی مستحکم قومیت پیدا کریں جو خطرات کا مستعدی کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔

باب ۵

یورپ کی جدید قومیت

قومیت کے جذبہ کی بنیاد درحقیقت اُس ذہنی تعلق پر ہے جو بعض مشترک خصوصیات کی بنا پر ایک جماعت کے افراد میں ایک دوسرے کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جس کے ذریعہ وہ جماعت اپنے آپ کو دوسری جماعتوں سے ممتاز کرنے لگتی ہے۔ عام طور پر مورخین کا خیال ہے کہ انسانوں میں جماعتی زندگی کے شروع ہوتے ہی قومیت کا آغاز بھی ہوا۔ لیکن قومیت اپنے ارتقار سے گذرتی ہوئی انیسویں اور بیسویں صدی میں جن منزل پر پہنچی وہاں اُس کا تصور کچھ اور ہی ہو گیا۔ انیسویں صدی میں یورپ کی سیاست میں یہ اصول عام طور پر تسلیم کر لیا گیا کہ ہر قوم کے لئے ایک ریاست ضروری ہے۔ اس وقت سے یورپ میں قومیت کا جو تصور قائم ہوا اُس کی دو خصوصیات تھیں۔ اوّل یہ کہ ہر قوم کو سیاسی اقتدار اعلیٰ حاصل ہو، دوم یہ کہ ہر قومی ریاست اپنے شہریوں سے یہ توقع کرے کہ وہ ہر حال میں اُس کے فرماں بردار رہیں گے اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے اپنی قوم کو بالا و برتر سمجھیں گے

قومیت کے جدید فلسفہ کی یہی دو خصوصیات ایسی ہیں جن کی وجہ سے دور حاضر میں قومی تعصبات اور تنگ نظری قومی زندگی کا لازمی جزو بن گئے ہیں اور قومیت کی تاریخ تمامتر جارحانہ اور جنگجویانہ قوم پرستی بن گئی ہے۔

سیاسی اقتدار اعلیٰ نے ہر قومی ریاست کو ان عظیم الشان اختیارات کا مالک بنا دیا ہے جن کی وجہ سے نہ وہ اپنے سیاسی اور ملکی طریق عمل میں کسی دوسرے کی مرضی کے ماتحت ہے اور نہ اپنے افعال میں کسی دوسرے کے سامنے جوابدہ، وہ ہر اس طریق کار پر عمل کر سکتی ہے جسے وہ اپنی قوم کے لئے ضروری سمجھے خواہ وہ دوسروں کے لئے مفید ہو یا مضر، وہ اپنے ملک کی حدود اور اپنے افواج و اسلحہ کی تعداد خود ہی مقرر کرتی ہے، دوسری قوموں کے ساتھ صلح و جنگ کے معاملات خود ہی طے کرتی ہے۔ اپنے ملک کی تجارتی درآمد برآمد، ٹیکس اور غیر قوموں کے ساتھ برتاؤ کے قوانین خود ہی متعین کرتی ہے۔ ان اختیارات نے قومی ریاستوں میں جو انانیت پیدا کی اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر لیں اور اپنی طاقت کے زعم میں اپنے مفاد کے مقابل دوسری قوموں کے مفاد کی مطلق پرواہ نہ کریں بلکہ جہاں تک ہو سکے دوسروں سے آگے نکل جانے کی کوشش کریں، مسابقت کی اس کوشش نے انھیں آپس میں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا۔ ہر قومی ریاست اپنے تحفظ کے لئے اپنی طاقت بڑھانے کی کوشش کرنے لگی، دفاع ملکی کے لئے اپنی مملکت کی حدود کو محفوظ کیا۔ فوجیں بڑھائیں اور اسلحہ میں اضافہ کیا۔ اپنے اقتصادی

مفاد کے تحفظ کے لئے اپنے معاشی وسائل کو صرف اپنے ہی لئے محدود کر لیا، اپنے ملک میں غیر قوموں کی مہاجرت پر پابندیاں عائد کر دیں، اور دوسرے ملکوں کے مال کی درآمد پر بھاری بھاری ٹیکس لگا دئے۔ اس روش کی بدولت غیر قوموں کے ساتھ منافرت کے جذبات روز بروز بڑھتے گئے، یہاں تک کہ خود اپنے ملک میں جو غیر قومیں اقلیتوں کی شکل میں آباد تھیں، ان کے ساتھ بھی نفرت کے جذبات پیدا ہوگئے اور ان کے وجود کو بھی قومی زندگی کے لئے مضر سمجھا جانے لگا اقلیتوں کے ساتھ قومی ریاستوں نے جس برتاؤ کو روا رکھا اس کی تازہ ترین مثال جرمنی میں یہودیوں کے ساتھ ہٹلر کا برتاؤ ہے۔

قومی خود غرضی کے جذبات سب سے زیادہ اس وقت بروئے کار آئے جب انیسویں صدی میں قومی ریاستوں کی تجارت کو فروغ ہوا۔ اس صدی میں صنعت و حرفت کے انقلاب نے یورپ کی تجارت کو بہت بڑھا دیا۔ ہر قومی ریاست اپنے یہاں تجارتی مصنوعات تیار کرنے لگی، ان مصنوعات کے لئے خام مال اور تجارتی منڈیوں کی ضرورت پیش آئی، اس ضرورت کے ماتحت قومی ریاستوں کے سرمایہ دار دنیا کے دوسرے ملکوں میں پہنچے، وہاں کثیر سرمایہ لگا کر تجارت شروع کی، اور دیسی حکومتوں سے مراعات حاصل کیں، ان کی یہ تجارت قومی جذبات کہلائی۔ اس قومی تجارت کو اگر کسی وقت دیسی حکومت یا کسی دوسرے بیرونی تاجر سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوا تو قومی ریاست اس کی پشت پناہی کے لئے آئی۔ اسی طرح

غیر منظم ملکوں میں قومی ریاستوں کے لئے فتوحات کا دروازہ کھلا، قومی مفاد، قومی حقوق اور قومی غیرت کا تحفظ ان فتوحات کے مقاصد قرار دئے گئے۔ افریقہ کی نوآبادیات، جنوبی امریکہ، مصر، ہندوستان اور منچوریہ میں اسی طرح قومیت کے لباس میں ملوکیت اور سرمایہ داری قائم ہوئی دنیا میں ملوکیت کے نظام کو جس چیز نے سب سے زیادہ تقویت پہنچائی وہ یہی قومیت تھی، برطانیہ، فرانس، ریاستہائے متحدہ امریکہ، جرمنی، اطالیہ اور جاپان کی قومی ریاستوں نے دنیا کی کمزور قوموں کو محکوم بنا کر اور اپنے اقتصادی منفعت کے خاطر انھیں تباہ و برباد کر کے خونریزی، سفاکی اور زبردست آزاری کی جو مثال پیش کی ہے وہ تاریخ میں شاید ہی کہیں ملے، اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی خاطر انھوں نے کروروں بندگان خدا کو پامال کیا، ان کے اخلاق، مذہب، معاشرت، ادب، اور مال و دولت کو برباد کیا۔ اور آن میں باہمی نفاق اور خونریزی کی تخم ریزی کر کے اپنی ان حکومتوں کو مستحکم کیا جن کا واحد مقصد محکوموں کو غلامی کے نشے میں سرشار رکھنا اور خاموشی کے ساتھ ان کا لہو پینا تھا، چنانچہ ایشیا اور افریقہ میں یورپ کا یہ ملوکی نظام ضعیفوں کے خون کے آخری قطرات تک چوس رہا ہے۔

ضعیف قوموں کو تباہ و برباد کرنے اور اقتصادی میدان میں اپنے حریف سے آگے نکل جانے کی کوشش میں قومی ریاستوں کا ایک دوسرے سے متصادم ہونا لازمی تھا، اس تصادم نے جنگ و جدال کا جو بازار گرم کیا اس کی مثال وہ قومی جنگیں ہیں جو انیسویں اور بیسویں صدی میں لڑی گئیں

جن میں لاکھوں انسان بیدردانہ موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے، اور سائنس کے تباہ کن آلات سے انسانی تہذیب و تمدن کی عمارت مسمار کی گئیں۔ یورپ کی موجودہ جنگ بھی اسی قسم کی ایک نئی بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ یہ تو جنگ عظیم سے پہلے کے حالات ہوئے اب ذرا جنگ سے بعد کے حالات پر بھی نظر ڈال لیجئے۔ جنگ عظیم کے اثرات کی وجہ سے دنیا میں جو اقتصادی کساد بازاری عام ہوئی اس نے قوم پرستی کے جذبات کو بہت تقویت پہنچائی۔ جنگ عظیم کے بعد یورپ کی وہ ریاستیں جو صنعتی اور تجارتی مقابلے میں دوسری قوموں سے کمزور ثابت ہوئیں اپنی قومی تنظیم کے لئے آمادہ ہوئیں۔ اطالیہ جرمنی اور وسطی اور مشرقی یورپ کی ریاستوں میں جو قوم پرستی رائج ہوئی ہے اس کا سبب یہی تھا کہ جنگ عظیم کے بعد ان ملکوں کی اقتصادی حالت ایسی نہ رہی تھی کہ یہ دوسری قوموں کے دوش بدوش دنیا میں ترقی کر سکتے۔ اطالیہ کے پاس اُن ذرائع کی بہت کمی تھی جو صنعت و حرفت کے لئے درکار ہیں۔ جرمنی جنگ میں ہار کر اپنا سب کچھ کھو چکا تھا۔ وسطی اور مشرقی یورپ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں اقتصادی ترقی کی رفتار یا تو بہت سست تھی یا بالکل معدوم تھی، اس لئے ان تمام ریاستوں کو اپنی اقتصادی حالت سنبھالنے کی فکر دامنگیر ہوئی اور اسی مقصد کے ماتحت وہ اپنی قومی تنظیم پر آمادہ ہوئیں، چنانچہ اطالیہ میں "فاشسیت" اور جرمنی میں "قومی اشتراکیت" کی تحریکیں وجود میں آئیں۔ ان ملکوں میں اقتصادی کساد بازاری نے جو عام بے چینی پیدا کر دی تھی اُس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اہل ملک ایسی حکومت کا مطالبہ کریں جو

ملک میں قومی اتحاد پیدا کر سکے اور پھر اپنی قوت کے بل بوتے پر ملک کے اندر
اور باہر قوم کے اقتصادی اور معاشی اغراض کے حصول کی کوشش کر سکے۔
چنانچہ ان دونوں تحریکوں کا مقصد ملک کی اندرونی کساد بازاری اور بے روزگاری
کو دور کرنا اور اپنے ملک سے باہر تجارتی منڈیاں اور تجارتی حقوق و مراعات
حاصل کرنا قرار دیا گیا۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے قوم کی طرف سے
پورے جوش و خروش کا اظہار ہونے لگا۔ یہ جوش و خروش جس قدر زیادہ
ہوتا گیا دنیا کے امن و امان کے لئے یہ اقتصادی قومیت اتنی ہی خطرناک
ہوتی گئی۔

اور سچ تو یہ ہے کہ آج جرمنی اور اطالیہ اور کل یورپی ممالک کی روش
صاف صاف یہ بتا رہی ہے کہ حق وہ ہے جو ان کی زبان سے ادا ہو اور
جس سے ان کے مفاد کو تقویت پہنچے۔ یورپی سیاست کے اس اصول
نے دنیا کے سامنے عملاً ثابت کر دیا کہ سیاست میں اخلاقی اصول پرستی
کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ایک طرف تو علوم و فنون
اور تہذیب و تمدن کی یکسانی انسانوں کو ایک دوسرے سے قریب کر رہی
ہے اور دوسری طرف موجودہ دور کی سیاسی اور اقتصادی قومیت انھیں اس
طرح جدا کر رہی ہے کہ ایک دوسرے کے جان و مال کا دشمن نظر آرہا ہے۔
اب دنیا میں اگر امن و عافیت کی کوئی صورت نظر آتی ہے تو یہی ہے کہ
انسان جغرافی وطنیت اور رنگ و نسل کے امتیازات مٹا کر اور قوم پرستی کی تنگ
نظری سے باہر آکر عام انسانی اخوت، حریت اور مساوات کے اصول کی

اہمیت سمجھیں، اور قومی ریاستیں طاقت اور خودغرضی کے نصب العین سے ہٹ کر ہمسایہ کے ساتھ محبت اور مہر کے ساتھ عدل کے اصول پر کاربند ہوں اور اپنی چھوٹی سی دنیا اور اس کے محدود وسائل سے باہر نظر دوڑائیں، بنی نوع انسان کی خدمت کا جذبہ اور ان کی رہبری کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں دوسروں کے ساتھ رواداری اور ایثار کا برتاؤ کرنا سیکھیں، اور انسانیت کی قدر پہچانیں۔ دنیا میں حق و انصاف کی یہ فضا اس وقت تک نہ پیدا ہو سکی گی جب تک کہ دنیا کی تمام تعلیمی قوتوں کی توجہ کا مرکز انسانیت کے احترام کا درس نہ ہوگا۔

انسانی ترقی کی تاریخ کے پیش نظر قومیت سے انکار کرنا ناممکن ہے۔ دنیا میں قوموں کا بننا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ ہر قوم کی تہذیب صدیوں میں پیدا ہوئی ہے، جس کو مٹایا نہیں جا سکتا اور انسانیت کی بقا بھی اسی میں ہے کہ اس کو محفوظ رکھا جائے، لیکن تاریخ میں جو چیز نئی اور انوکھی ہے وہ قومیت کا جدید فلسفہ ہے جس نے انسانوں میں خودغرضی، تعصب، تنگ نظری، باہمی منافرت اور جنگ و جدال کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں، اور قوموں کو انانیت کا سبق دے کر ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔

جب تک ہر انسان دوسرے کے ساتھ ایثار، اخلاق اور رواداری برتنا نہ سیکھے گا اور دنیا میں قومیت کی جگہ بین الاقوامیت نہ لے گی انسانیت اسی طرح خطرے میں رہے گی۔

باب ۶

آفاقیت

قومیت کی ابتدا عہدِ جدید سے ہوئی۔ عہدِ وسطیٰ کے سیاسی مفکر "آفاقیت" کے قائل تھے۔ جو اپنے مفہوم میں "قومیت" کے بالکل برعکس ہے۔ قومیت کا تقاضہ ہے کہ انسان اپنے ملک اور وطن کی قیود سے باہر نہ ہو، آفاقیت یہ طلب کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عالمِ انسانی کا ایک رکن سمجھے۔ دنیا کو اپنا وطن خیال کرے اور اپنے کلچر اور اپنی سیاسی معاشرتی اور تجارتی اغراض کو قومیت اور نسلیت کی قیود سے آزاد رکھے۔ اپنے ابنائے جنس کے ساتھ اس کا رشتہ ایک عالمگیر اخوت پر قائم ہو، جس میں قومی اور نسلی امتیازات کو کوئی دخل نہ ہو۔

دنیا میں آفاقیت کا تصور قدیم زمانے سے چلا آتا ہے، اس کی ابتدا یونانیوں نے کی، سکندرِ اعظم کی فتوحات کے ساتھ جب یونانیوں کے قدم اپنی شہری ریاستوں سے باہر نکلے اور انھوں نے اپنے اغراض و مقاصد کو دوسرے ملکوں کے انسانوں کے ساتھ وابستہ پایا تو انھوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ ایک عالمگیر انسانی رابطہ قائم کیا جائے۔ ان کے

بعد رومیوں کی اس کوشش نے کہ ساری مہذب دنیا کو رومی سلطنت میں شامل کر کے تمام انسانوں کو ایک مرکز پہ جمع کر دیا جائے آفاقیت کے تخیل کو اور بھی تقویت بخشی سلطنت روما کے زوال کے بعد روم کے گرجانے بھی آفاقیت کو عالم مسیحیت کی تنظیم کی بنا قرار دیا، اور ایک ایسے معاشرے کے قیام کی کوشش کی جو قومیت اور وطنیت کی تنگ نظریوں سے آزاد ہو، اور جس کی بنیاد عالمگیر اخوت پر ہو۔ عہد جدید میں بھی اٹھارہویں صدی کے بعض سیاسی مفکر آفاقیت کے قائل تھے لیکن اس دور میں "قوم پرستی" کے جو جذبات یورپ میں پیدا ہوئے ان کے مقابلے میں آفاقیت کو کسی قسم کی کامیابی نصیب ہونا ناممکن تھا۔

آفاقیت کے حامی فرد کے مفاد اور اس کے فلاح و بہبود کو معاشرے کی سب سے مقدم احتیاج اور اس کا سب سے مقدم فرض تصور کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ معاشرے کو افراد کا مجموعہ قرار دیتے ہیں نہ کہ اقوام کا۔ ان کا خیال ہے کہ اگر معاشرے کی بنیاد قوموں کی تقسیم پر قائم کی جائے گی تو اقوام عالم کی نفسانیت اور خود غرضی کسی طرح نوع انسانی کے لئے راحت اور آسودگی کا سامان مہیا نہیں کر سکتی بلکہ قوموں کی باہمی جنگیں اور آپس کے نزاعات انسانیت کے لئے ہمیشہ تباہی اور مصیبت کا باعث ہوں گے، اس لئے فرد پر معاشرے کی طرف سے یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے تمام دوسرے افراد کے ساتھ خواہ وہ کسی حصہ زمین پر بستے ہوں اور کسی نسل اور قوم سے ہوں محبت اور رواداری کا ایک ایسا رشتہ

قائم کرے جس میں وطن نسل اور قومیت کے امتیازات سرے سے مفقود ہوں۔ اس طرح دنیا میں ایک ایسا عالمگیر اخلاقی قانون رائج ہو جائے گا جو مخصوص قوموں کا نہ ہوگا بلکہ بحیثیت مجموعی تمام عالم انسانی کا ہوگا۔ اسی قانون کے ذریعے افراد ایک دوسرے سے وابستہ ہوں گے۔ اور ہر فرد دوسرے کی بھلائی کو اپنی بھلائی سمجھے گا۔ آفاقیت کے نظریہ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ ناممکن العمل ہے۔ آفاقیوں کی خیالی دنیا حقیقتاً انسانی اخلاق کی انتہائی رفعت کی مثال ہے لیکن فطرت انسانی کے پیش نظر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایسی دنیا کا قیام ناممکن ہے۔ انسان کی نفسیاتی حالت کے بالکل منافی ہوگا اگر اس سے توقع کی جائے کہ وہ قومی امتیازات کو فراموش کر سکے گا" دنیا میں زبان، مذہب، سیاست، اخلاق، اور حکومت کے اختلافات کو مٹا سکے گا اور تمام بنی نوع انسان کو ایک حالت پر لا سکے گا۔ فرد اپنی زبان، تہذیب، ادب، اور تاریخ سے ایک قلبی واسطہ رکھتا ہے۔ نوع انسان کی نہ کوئی ایک زبان ہے، نہ ایک ادب، نہ ایک تہذیب، نہ ایک تاریخ، پھر قومیت کی حدود سے باہر ہو کر نوع انسانی کو اپنی قوم سمجھنا اس کے لئے کس قدر ناممکن ہے۔ اس کے اور نوع انسان کے درمیان مواصلت پیدا کرنے والی چیز درحقیقت قوم ہے اور قومیت ہی کا احساس معاشرے کے ساتھ اس کے تعلق کو نتیجہ خیز بناتا ہے" قوم فرد اور نوع انسانی کی درمیانی کڑی ہے، وہ ایک طرف تو انسانی شخصیت کو ایک خاص رنگ دیتی ہے، دوسری طرف اس شخصیت کو عام انسانی

معاشرے میں کوئی خاص کام انجام دینے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ قوم اور نوع انسانی کا رشتہ ویسا ہی ہے جیسا فرد اور قوم کا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قوموں میں اتنا باہمی ربط نہیں ہو سکتا جتنا کہ افراد میں ہوتا ہے، ہر قوم کا اپنا جداگانہ ضمیر اور اخلاقی معیار ہوتا ہے مگر جس طرح افراد اخلاقی قانون وضع نہیں کر سکتے اور اپنے عمل میں انھیں معاشرے کے آئین اور معیار کا لحاظ کرنا ہوتا ہے، ویسے ہی قومیں بھی بڑی حد تک اس پر مجبور ہوتی ہیں کہ عام انسانی معیار کا لحاظ رکھیں اور انھیں اپنے مقاصد میں کامیابی نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان کا طرز عمل عام مقبولیت نہ حاصل کرے"

قوم کو چھوڑ کر براہ راست نوع انسان سے واسطہ قائم کرنے میں فرد کے لئے ایک اور دشواری بھی ہے۔ عام عالم انسانی کے مسائل اس قدر وسیع ہیں کہ فرد اگر ان کے حل کرنے کی عملاً کوشش بھی کرے تو کامیاب نہیں ہو سکتا، اس کے برخلاف قومی زندگی کے مسائل اتنے وسیع نہیں ہوتے۔ ان کو وہ سمجھ سکتا ہے اور حل کر سکتا ہے، اس لئے قومیت کا احساس افراد کے جوش عمل اور حوصلوں کو ترقی دیتا ہے، اسی وجہ سے دور حاضرہ کے مفکرین کا خیال ہے کہ فرد اور نوع انسانی دونوں کی بہبودی کے لئے لازمی ہے کہ عالم انسانی کی قوموں میں تقسیم ہو اور اس تقسیم پر عالمگیر انسانی اخوت کی بنیاد قائم کی جائے۔ ان کا خیال ہے کہ وطنیت کا جذبہ انسانیت کے جذبہ کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ ہر قوم اپنے ہی مفاد اور اپنی ہی بہبودی کو پیش نظر رکھے گی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ قومیں آپس میں اتحاد قائم

کر سکے ایک دوسرے کے ساتھ رواداری اور عدل و انصاف کا برتاؤ بھی کر سکتی ہیں۔ ایسی صورت میں ان کو انسانیت کے عام مفاد کو اپنا نصب العین بنانا ہوگا اور نسلی، معاشرتی، وطنی لسانی اور براعظمی تنگ نظری سے نکل کر عام عدل و انصاف کے اصول پر کاربند ہونا پڑے گا، اس طرح انسان اور انسانی اجتماعات ایک دوسرے سے قریب تر ہو جائیں گے۔ دنیا کے مختلف حصوں کے بسنے والے آپس میں ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور دنیا میں ایک عالمگیر بھائی چارے کی بنیاد پڑ سکے گی۔ یہ جذبہ جس کے ماتحت قوموں میں ہمسایہ کی محبت اور ہمسر کے ساتھ عدل کرنے کی عادت پیدا ہو جائے "بین الاقوامی جذبہ" کہلاتا ہے۔

باب ۸

بین الاقوامیت

موجودہ دور میں انسان خواہ دنیا کے کسی گوشے میں سکونت رکھتا ہو دنیا کے دوسرے حصّوں میں بسنے والوں سے بے تعلق ہو کر نہیں رہ سکتا۔ سائنس کے انکشافات مثلاً ریلوے، دخانی جہاز، تاربرقی، ٹیلیفون، کیبل ریڈیو، وغیرہ نے وقت اور فاصلے کی قیود کو مٹا دیا ہے اور دنیا کا ایک حصہ دوسرے سے قریب تر ہو گیا ہے۔ خبر رسانی کے ذرائع اور سینما کی بدولت دنیا کے ہر ملک کا انسان دوسرے ملکوں کے تازہ ترین واقعات سے باخبر ہے اور اپنے ابنائے جنس کے حالات سے متاثر ہو رہا ہے۔ دنیا کے ایک گوشے میں اگر کوئی تحریک شروع ہوتی ہے تو اس کے اثرات کرۂ ارضی کے ہر حصّے تک پہنچتے ہیں۔ اگر کسی ایک مذہبی جماعت کے ساتھ کسی ایک ملک میں ظلم یا ناانصافی کا برتاؤ کیا جاتا ہے تو دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے ہم مذہب بے چین ہو جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہمدردی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی ایک ملک میں مزدور جماعت کسی مالدار طبقے کے خلاف آواز اٹھاتی ہے تو تمام دنیا کے مزدور

طبقے میں ایک عام بے چینی پھیل جاتی ہے۔ اگر دو ملکوں کے درمیان نزاع شروع ہوتا ہے تو دیکھتے دیکھتے وہ نزاع عالمگیر جنگ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ آئے دن کے واقعات ہیں جو روزانہ ہماری نظروں کے سامنے آتے رہتے ہیں، ان کے ساتھ ہی ساتھ انسان کی اقتصادی ضروریات بھی اس دور میں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ ان کے پورا کرنے کے لئے وہ صرف اپنے ہی ملک کے معاشی ذرائع پر اکتفا نہیں کر سکتا۔ اپنی ضروریات کی تمام چیزیں تیار نہیں کر سکتا۔ وہ بعض مخصوص مصنوعات میں مہارت پیدا کر لیتا ہے اور باقی ضروریات کے لئے دوسری قوموں سے لین دین جاری کرتا ہے اس طرح دنیا کے تمام ممالک کسی نہ کسی شکل میں آپس میں ایسا تجارتی تعلق رکھتے ہیں جو ان کی زندگی کا لازمی جز ہے۔ ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ ہمارا تعلق صرف اسی مخصوص قوم یا سیاسی جماعت سے نہیں ہے جس کے ہم ایک جزو ہیں بلکہ اس بڑی دنیا سے ہے جس میں تمام قومیں باہمدگر وابستہ ہیں، اور جس کی فلاح اور ترقی کے لئے ضروری ہے کہ قومی خود غرضی کے مقابلہ میں بین الاقوامی رواداری کو ہم اپنا مطمح نظر بنائیں اور قومی اقتدار کے مقابلے میں بین الاقوامی اتحاد پر زور دیں۔ آزاد قوموں کا ایک ایسا اتحاد جس میں شامل ہو کر وہ صلح و امن کے ساتھ رہنے کا وعدہ کریں اور عدل و مساوات کے اصول پر کاربند ہوں بین الاقوامیت کہلاتا ہے۔

بین الاقوامیت کی اساس قومیت پر قائم ہے۔ ریمزے میور

لکھتا ہے کہ "کامیاب قومیت ہی وہ بنیاد ہے جس پر موثر بین الاقوامیت قائم کی جا سکتی ہے" اسی طرح برنارڈ جوزف لکھتا ہے "حقیقی بین الاقوامیت اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کی اساس قائم کرنے کے لئے قومیں نہ ہوں" یہی مصنف ایک دوسری جگہ کہتا ہے کہ "قوم انسان اور نوع انسانی کے درمیان لازمی کڑی ہے" یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ جنگ جویانہ قوم پرستی جیسی کہ آج کل یورپ کے بعض ملکوں میں پائی جاتی ہے بین الاقوامیت کے بالکل منافی ہے۔ بین الاقوامیت کے لئے تو وہ قومیت درکار ہے جو اپنے اندر تہذیبی اخلاقی اور روحانی خوبیاں رکھتی ہو اور جو "خود زندہ رہو اور دوسروں کو زندہ رہنے دو" کے اصول پر کاربند ہو۔ جو شخص اپنی قوم اور اپنے وطن کے ساتھ محبت رکھتا ہے اس کا فرض ہے کہ اس محبت کا بھی احترام کرے جو دوسروں کو اپنی قوم اور اپنے وطن سے ہو۔ ایسے ہی لوگ دوسروں کے لئے اپنا آغوش وا کر سکتے ہیں اور ان کے ساتھ یگانگت اور اتحاد کا رشتہ پیدا کر سکتے ہیں۔

باب ۸

بین الاقوامیت کا ارتقاء

یونانی شہری ریاستوں کے باہمی تعلقات

مملکتوں میں آپس میں تعلقات قائم کرنے کا دستور قدیم زمانے سے چلا آتا ہے، یونان کی قدیم آزاد شہری ریاستوں میں بھی آپس کے تقریباً وہ تمام تعلقات قائم تھے جو آج کل قومی ریاستوں کے درمیان قائم ہیں یہ شہری ریاستیں آپس میں ایک دوسرے کے یہاں سفیر بھیجتی تھیں، جنگ شروع کرنے سے پہلے باقاعدہ اعلان جنگ دیتی تھیں، مقررہ طریقوں پر صلح کرتی تھیں اپنے مقتولوں کو دفن کرنے کے لئے جنگ ملتوی کرتی تھیں۔ اپنے میں اتحاد اور انجمنیں قائم کرتی تھیں بعض اوقات "اپنا توازن طاقت" قائم رکھنے کے لئے آپس کے معاہدے کرتی تھیں، کبھی کبھی آپس کے نزاعات کو ثالثی اور عدالت کے ذریعے طے بھی کرالیتی تھیں، وہ جنگی قیدیوں کا تبادلہ بھی کرلیتی تھیں لیکن زیادہ تر قیدیوں کو یا تو قتل کردیا جاتا تھا یا غلام بنالیا جاتا تھا۔

سلطنت روما کے بین الاقوامی قوانین

روما کی سلطنت اگرچہ اتنی وسیع تھی کہ تقریباً ساری مہذب دنیا پر پھیلی ہوئی تھی اور کسی دوسری سلطنت کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتی تھی پھر بھی رومیوں کے یہاں ایسے قوانین اور رسم ورواج موجود تھے جو بین الاقوامی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ بھی جنگ کا اعلان باقاعدہ طور پر دیتے تھے، رومن قوم قانون کی بہت دلدادہ تھی۔ اس نے غیر قوموں کے ساتھ صلح و جنگ دونوں کے لئے واضح قوانین بنائے تھے۔ جن ملکوں کے ساتھ روما کا عہد نامہ ہوتا تھا ان کے شہریوں کو قانونی چارہ جوئی کا حق دیا جاتا تھا، غیر ملکوں کے سفیر کی ذات محفوظ سمجھی جاتی تھی، اگر کوئی شخص اس کو نقصان پہنچاتا تو اس شخص کو سفیر کی مملکت کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔

رومنوں کی یہ خواہش تھی کہ ساری مہذب دنیا کو رومن سلطنت میں شامل کر کے ایک سیاسی نظام کے ماتحت کر دیا جائے۔ اسی کوشش میں انھوں نے نسلی اور معاشرتی امتیازات برطرف کر کے غیر قوموں کو ذلیل اور دشمن سمجھنے کا پرانا خیال ترک کیا، اور ان کے ساتھ حق و انصاف کا برتاؤ کیا، اسی وجہ سے ان کے قانون میں ہمہ گیری پیدا ہو گئی، اور اس نے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لی۔ ان کی سلطنت میں دنیا کے ہر گوشے سے لوگ آتے تھے، اور

بعض نے تو یہاں سکونت بھی اختیار کرلی تھی۔ رومنوں نے ان غیر رومنوں کے لئے ایک علیحدہ "قانون نافذ کیا جس کو "قانون اجانب" کہتے ہیں۔ اس قانون کے اصول "فطری" یا اخلاقی قانون پر مبنی تھے، اور اس لئے تمام قوموں پر اس کا نفاذ ہوسکتا تھا۔ عہد وسطیٰ کے اختتام پر "قانون بین الاقوام" کے موجدوں نے انہیں اصولوں سے مدد لی اور بین الاقوامی رسم ورواج کی بنیاد انھیں پر قائم کی یہاں تک کہ آج تک "قانون بین الاقوام" کا دارو مدار انھیں اصولوں پر ہے۔

قانون اسلام اور بین الاقوامیت

چھٹی صدی عیسوی دنیا میں قانون اسلام کا زمانہ ہے۔ اس قانون نے بھی دنیا میں بین الاقوامی نقطۂ نظر میں حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا کیں۔ اسلام نے ایک طرف تو نسل، رنگ، قومیت وطن اور تہذیب کے امتیازات کو مٹا کر تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک رشتۂ اخوت میں منسلک کردیا اور دوسری طرف غیر قوموں کے ساتھ انھیں صلح داشتی اور عدل وانصاف کے اصول پر کاربند ہونے کی تعلیم دی اسلامی حکومت امن وامان اور عدل وانصاف کی حکومت تھی۔ اس نے اپنے قول وفعل دونوں سے ثابت کردیا کہ حقوق عامہ میں سب انسان برابر ہیں خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ فتح مکہ کے بعد جب بحرین، عمان،

عدن وغیرہ مسلمانوں کے قبضے میں آئے اور عیسائی، پارسی اور یہودی
جو ان علاقوں میں بکثرت آباد تھے اسلام کی رعایا بنے تو خود پیغمبر اسلام
علیہ الصلوٰۃ والسلام نے غیر مسلم رعایا کے حقوق کی   کر دی۔ اس
کے بعد جب حضرت عمرؓ کی خلافت کے عہد میں اسلامی حکومت کی
وسعت میں اضافہ ہوا اور مسلمانوں کے غیر قوموں سے وسیع تعلقات
قائم ہوئے تو رعایا کے جتنے حقوق قائم کئے جا سکتے تھے ان میں سے
ہر ایک کی نسبت شریعت اسلامی نے صاف صاف فیصلہ کر دیا۔

اسلام نے غیر قوموں کی تین قسمیں کی ہیں (۱) ذمّی (۲) مستامن
(۳) حربی۔ ذمّی وہ لوگ ہیں جو اسلام کی رعایا ہوں اور جزیہ ادا کرتے
ہوں۔ جزیہ کے معاوضے میں حکومت ان کے حفظ و امان کی ضامن
ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ جزیہ اس لئے ہے کہ ذمّی
کی جان و مال مسلمان کی جان و مال کے برابر ہو جائے۔ جزیہ کے عوض
ذمیوں کو یہ حقوق دیئے گئے ہیں کہ اگر ان پر کوئی دشمن حملہ کرے گا
تو ان کی طرف سے مدافعت کی جائے گی۔ ان کے خلاف جارحانہ
جنگ نہیں کی جائے گی۔ ان کے جان، مال، زمین اور تجارت محفوظ
رہیں گے۔ ان کو مذہبی آزادی دی جائے گی۔ ان سے عشر نہیں
لیا جائے گا اور ان کا کوئی حق جو انھیں پہلے سے حاصل تھا زائل
نہیں ہوگا۔ دوسری قسم مستامن ہے یعنی وہ لوگ جو سفر میں ہوں
اور حکومت کی زیر حمایت زندگی بسر کرتے ہوں اور تیسرے حربی ہیں

یعنی وہ لوگ جو اس ملک میں رہتے ہوں جو علانیہ اسلام کا دشمن ہے اور حریف جنگ ہے اور جہاں مسلمانوں کو امن نہیں۔ اگر یہ لوگ عہد شکنی کرکے آمادۂ جنگ ہوں تو ان کے خلاف جہاد کی اجازت ہے۔
اسلام میں جہاد کا مقصد دنیا سے فتنہ و شر کا مٹانا اور جنگ ہی سے جنگ کا خاتمہ کرنا ہے تاکہ دنیا صلح و امن کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ اس لئے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جنگ میں بچوں عورتوں اور قاصدوں کو قتل نہ کریں۔ فراخ حوصلگی کے ساتھ پیغام صلح قبول کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہیں۔ اور اسیران جنگ کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ اسیران جنگ کے متعلق یہ قاعدہ بنا دیا گیا کہ ان کو آرام و آسائش سے رکھا جائے۔ بہتر یہ ہے کہ یوں ہی چھوڑ دیا جائے ورنہ قلیل فدیہ لے کر بالکل آزاد کر دیا جائے۔ قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی ابتدا ر جنگ بدر سے ہوئی۔ جو قیدی فدیہ نہیں ادا کر سکتے تھے ان کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا اور ان میں سے جو لکھنا جانتے تھے ان کو حکم ہوا کہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔ فتح مکّہ کے وقت پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قریش مکّہ سے یہ ارشاد کہ "تم پہ کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو" دشمنوں کے ساتھ اسلام کی عفو درگزر کی ایسی مثال ہے جو تاریخ میں معدوم ہے۔ یہ وہی قریش تھے جنھوں نے اب تک آنحضرت صلعم کو تکالیف پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ یہاں تک کہ اب سے صرف آٹھ برس پیشتر آپ کو وطن کی آغوش سے انھوں ہی نے جدا کیا تھا۔

مسیحی دنیا کا اتحاد اور تحریک احیاء واصلاح

عہد وسطیٰ میں یورپ میں آفاقیت کا دور دورہ تھا۔ پاپائیت اور مقدس سلطنت روما دونوں آفاقیت ہی کے قائل تھے پاپائیت کو اس کی ترویج میں زیادہ کامیابی ہوئی۔ اس دور میں کلیسا کو عالم مسیحیت میں پورا پورا اثر و اقتدار حاصل تھا اور وہ عرصے تک مسیحی دنیا کو رشتۂ اخوت و اتحاد میں جوڑے رہا لیکن جب دور جدید کی ابتدا میں احیاء واصلاح کی تحریکوں نے پاپائے روم کے مذہبی اثر و اقتدار پر آخری ضرب لگائی تو مسیحی دنیا کا اتحاد ختم ہو گیا۔ اور یورپ کی ہر مملکت اپنے آپ کو جداگانہ قوم کہنے لگی، پروٹسٹنٹ اصلاح کے علمبردار مارٹن لوتھر سے جس وقت پوچھا گیا کہ اخلاقی قانون کا ثالث کون ہے تو اس نے جواب دیا "مملکت کا فرمانروا" لوتھر کی اس تعلیم سے ایک طرف مسیحی دنیا کا اخلاقی اتحاد ختم ہوا اور دوسری طرف موجودہ قوم پرستی اور قومی اقتدار اعلیٰ کے تخیل کی داغ بیل پڑی سولہویں صدی تک مغربی یورپ سے عہد وسطیٰ کا جاگیردارانہ نظام ختم ہو گیا اور اس کی جگہ قومی ریاستیں وجود میں آگئیں۔ ہر ریاست ایک علیحدہ حکمراں کے ماتحت تھی جو اپنی حدود مملکت میں مطلق العنان تھا۔ اس کا حق فرمانروائی خداداد تسلیم کیا جاتا تھا اور یہ عقیدہ عام تھا کہ حکمراں خدا کی طرف سے حکومت پر مامور کیا جاتا ہے اس لئے اس کو جو حقوق حاصل ہیں ان سے وہ محروم

نہیں کیا جا سکتا اور اپنے افعال میں وہ خدا کے سوا کسی کے سامنے جوابدہ نہیں۔ اس نظریہ نے یورپ کے مغربی ممالک پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ حکمرانوں کا نصب العین اپنی قوت اور طاقت کو بڑھانا اور اپنی ریاست کو ترقی دینا قرار پایا اور رعایا کا فرض ان حکمرانوں کی اطاعت ٹھہرا۔ چنانچہ اس دور میں برطانیہ، فرانس، ہسپانیہ، پرتگال، سویڈن اور ناروے کی قومی ریاستوں کے لئے شخصی حکمرانوں کی کوششوں نے ہر قسم کی دنیوی ترقی کی راہیں کھولدیں۔ اور ان کے دلوں میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرنے کی خواہش پیدا کر دی۔ اسی خواہش کے ماتحت ان ریاستوں میں آپس کے مقابلے اور مسابقت کا جذبہ پیدا ہوا۔ طاقت اور دولت کی طمع نے ایک کو دوسرے کا دشمن بنا دیا، رفتہ رفتہ حسد و عناد کے شعلے اس قدر بھڑکنے لگے کہ سولھویں اور سترھویں صدی میں یورپ کے کسی نہ کسی حصہ میں ہر سال ایک نہ ایک جنگ ہوتی رہی۔ اس پُر آشوب دور میں بین الاقوامیت کو کامیابی نصیب ہونا ناممکن تھا، بایں ہمہ اس زمانے میں بھی بین الاقوامی اتحاد کی کوششیں ہوتی رہیں، یہ کوششیں اگرچہ کامیاب نہ ہوئیں مگر ان کی اصل غائت یہی تھی کہ یورپ کی تمام قوموں کو کسی ایسے مشترک اقتدار کے ماتحت لے آیا جائے جو ان کو آپس میں صلح و امن قائم رکھنے پر مجبور کر سکے۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں بین الاقوامی تنظیم کے منصوبے

سترھویں صدی کی ابتدا میں فرانس کے مدبر سلی Duc De Sulley نے فرانس کے بادشاہ ہنری چہارم کے روبرو اپنی "تجویز اعظم" پیش کی جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ روس اور سلطنت عثمانیہ کو چھوڑ کر کل یورپ کو پندرہ حصوں میں تقسیم کردیا جائے اور یہ حصے اپنا ایک وفاقیہ قائم کریں جو عیسائی جمہوریت کے نام سے موسوم ہو۔ صدر جمہوریہ کی اعانت کے لئے چونسٹھ نمایندوں کی ایک مجلس ہو جو مملکتوں کے مشترک اغراض و مقاصد اور باہمی نزاعات اور اختلافات کو ثالثی کے اصول پر طے کیا کرے۔

مجلس کی امداد کے لئے ایک بین الاقوامی فوج اور ایک جہازی بیڑا ہو جن کے ذریعہ وہ اپنے فیصلوں کو منوا سکے۔ اسی صدی میں صلحنامہ اُٹ رخٹ (Utrecht) کے بعد Abbe de St. Pierre نے بھی یہی تجویز کیا کہ دنیا میں امن عامہ قائم کرنے اور جنگ کا مستقل طور پر سدباب کرنے کے لئے تمام مملکتوں کی ایک مجلس ہو جسے اپنی بات جبراً منوانے کا حق حاصل ہو۔ اس کے بعد فرانس کے مشہور فلسفی روسو نے تجویز کیا کہ دول یورپ اپنا ایک وفاقیہ قائم کریں جو بین الاقوامی نزاعات اور جنگ و جدال کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنے پاس مستقل قوانین رکھتا ہو۔ اسی صدی کے آخری حصے میں جرمنی کے مشہور فلسفی امانول کانٹ نے بھی امن عامہ کے قیام کے لئے کوشش کی۔

ان دو صد سالہ کوششوں کے باوجود یورپ میں بین الاقوامی اتحاد

قائم نہ ہو سکا۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ توازن طاقت کے نظریہ نے سیاسی مملکتوں کے درمیان قومی خود غرضی کے جذبہ کو بام عروج تک پہنچا دیا تھا اور ان کے آپس کے نزاعات حد سے گزر گئے تھے۔ ایسی حالت میں ان کے درمیان کسی قسم کی مفاہمت ممکن نہ تھی۔

اٹھارویں صدی کی انھیں جنگوں کے مصائب کی وجہ سے دنیا میں حکمرانوں کے خلاف آواز اٹھی اور عمومیت کے قیام کی کوشش ہونے لگی۔ ۱۷۸۹ء میں امریکہ کی ان ریاستوں نے جو انگلستان سے آزاد ہو گئی تھیں اپنا ایک وفاقیہ قائم کر کے بین الاقوامی اتحاد کی ایک ایسی مثال پیش کر دی جس سے بین الاقوامیت کے اصول کو بہت تقویت پہنچی۔ اٹھارویں صدی میں بین الاقوامیت کے جذبہ کو ترقی دینے میں سائنس کے انکشافات نے بھی بڑی مدد دی۔ گالی لیو، کوپرنی کوس، براہے، ڈیکارٹ، نیوٹن جیسے سائنسدانوں کی تحقیقات نے عام عالم انسانی میں ایک ذہنی رابطہ پیدا کر دیا۔

انیسویں صدی کی بین الاقوامی کوششیں

انیسویں صدی بین الاقوامیت کے تخیل کی ترقی کا زمانہ ہے۔ اس صدی میں قوموں کے باہمی نزاعات کے تصفیہ کے لئے باقاعدہ کانفرنسیں یا کانگریسیں منعقد کی جاتی تھیں۔ سب سے پہلی کانگریس "ویانا کی کانگریس" تھی جو ۱۸۱۴-۱۵ء میں منعقد ہوئی۔ نپولین کو آخری شکست

شکست دینے کے بعد یورپی قوموں نے اسی کانگریس میں اپنے معاملات طے کئے۔ ان قوموں میں سے برطانیہ، پروشیا، اسٹریا اور روس نے اپنے نزاعات کے تصفیئے کے لئے جو اتحاد کیا اس کو ائتلاف یورپ (The Concert of Europe) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ائتلاف یورپ میں شامل ہونے والی قومیں بھی اپنے معاملات کانفرنسوں ہی کے ذریعے طے کرتی تھیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم تک کانفرنسیں منعقد کرنے کا طریقہ اس قدر عام ہوا کہ سماجی، اقتصادی، سیاسی اور قانونی غرض ہر قسم کے بین الاقوامی معاملات کانفرنسوں ہی کے ذریعے طے کئے جاتے تھے۔ ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء کے درمیان ولندستان کے پایہ تخت ہیگ میں زار روس کی تحریک پر دو مشہور کانفرنسیں ہوئیں جو "ہیگ کانفرنسوں" کے نام سے موسوم ہیں۔ ان میں سے پہلی کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ تخفیف اسلحہ کے لئے بین الاقوامی معاہدے ہوں۔ اس کوشش میں تو کانفرنس کامیاب نہ ہوئی لیکن نزاعات کے تصفیئے کے لئے ثالثی کے مختلف اصول طے کرسکی اور مفاہمت کے لئے ہیگ میں ایک مستقل محکمہ بھی قائم کرسکی جس کو مستقل عدالت مفاہمت (The Permanent Court of Arbitration) کہا جاتا ہے اور جو اب تک موجود ہے۔ انیسویں صدی میں قوموں کے باہمی اشتراک عمل کے لئے کانفرنسوں کے علاوہ اور بھی بہت سے بین الاقوامی ادارے مثلاً بین الاقوامی اتحاد تار برقی (International Telegraph union)

بین الاقوامی اتحادِ ڈاک (Universal Postal Union)
سکوں پیمانوں اور وزنوں کا اتحاد (International Bureau of Weights and Measures.)
انجمن صلیب احمر (Red Cross Society) وغیرہ وجود میں آئے۔

قانون بین الاقوام

دنیا کے سیاسی مفکرین کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ دنیا میں قوموں کے درمیان آپس کے تعلقات قائم کرنے کے لئے قواعد بنائے جائیں چنانچہ اس قسم کے قواعد بنتے رہے ہے، آج کل انھیں قواعد کے مجموعہ کو "قانون بین الاقوام" کہا جاتا ہے۔ اس قانون کا دارومدار عہدناموں، صلحناموں، اور بین الاقوامی رسم ورواج پر ہے یہ قانون سب سے پہلے اطالیہ میں وجود میں آیا۔ اطالوی شہری ریاستیں آپس کے معاملات میں جس رسم ورواج کی پابندی کرتی تھیں۔ وہی آگے چل کر ضروری ترمیمول کے ساتھ یورپ کی قومی ریاستوں میں رائج ہوا۔
ولندستان کے مقنن Hugo Grotius نے ۱۶۲۵ء میں اپنی کتاب "قانون امن وجنگ" میں پہلی مرتبہ قانون بین الاقوام کو ایک فن کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا اس لئے اسے اس قانون کا موجد کہا جاتا ہے۔ اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ "فطری" یا

اخلاقی قانون حکمرانوں کے بنائے ہوئے قانون سے زیادہ وقیع ہے
اس لئے یورپ کی ریاستوں کو آپس کے معاملات میں اس قانون کی
پابندی کرنی چاہیئے۔ اس کے بعد دوسرے سیاسی مفکر بھی اس
قانون کے متعلق اصول قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ
اٹھارہویں صدی میں جرمی بلنتھم نے اپنی کتاب " اصول قانون بین الاقوام
لکھی، جس میں فرانس کے مشہور فلسفی روسو کے قائم کیئے ہوئے اصولوں
کو ترتیب دیا۔ لیکن انیسویں صدی تک اس قانون میں قطعیت پیدا
نہ ہوسکی، اس صدی میں یورپ کی مملکتوں نے آپس کے معاملات نپٹانے
کرنے کے لئے جو کانفرنسیں منعقد کیں اور ان میں جو بیشمار معاہدے اور
صلحنامے کئے ان سے بین الاقوامی قانون بآسانی اخذ کیا جا سکا۔
چنانچہ بیسویں صدی کے مفکر ویسٹ لیک اوپن ہیم وغیرہ نے اس کو
قطعی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کردیا۔ ان کانفرنسوں میں ہیگ کی
وہ دو کانفرنسیں قابل ذکر ہیں جو ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء میں ہوئیں اور جن
میں قانون جنگ کے بہت سے نکات مثلاً اعلان جنگ، تشدد، جنگی
بمباری، دشمن کی املاک اور خاتمہ جنگ وغیرہ کے متعلق قوانین یا جنگی
قیدیوں، جاسوسوں، زخمیوں اور بیماروں وغیرہ کے ساتھ برتاؤ کے
قاعدے طے پائے اور مفاہمہ ہیگ میں ان کا اعلان کیا گیا۔ ۱۸۸۶ء
کے اعلان سٹرز برگ اور ۱۹۰۶ء اور ۱۹۲۹ء کے مفاہمہ جینوا میں بھی
اسی قسم کے متفقہ بین الاقوامی قواعد کا اعلان کیا گیا تھا۔

آج جب کہ دنیا جنگ کی آگ میں جل رہی ہے ان بین الاقوامی قاعدوں اور قانونوں کا ذکر بے وقت کا راگ ہے۔ لیکن اگر انسانیت کا مستقبل بالکل تاریک نہیں ہے تو عجب نہیں کہ جنگ کے خاتمہ پر بین الاقوامی تنظیم ذرا زیادہ استوار بنیادوں پر کی جائے اور قوت محض پر اخلاق اور قانون غلبہ پانے کی ضرور کوشش کرے۔

بیسویں صدی اور بین الاقوامیت

انیسویں صدی میں وہ حکیمانی انکشافات ہوئے جنھوں نے یورپ کی صنعت و حرفت کی کایا پلٹ دی۔ اس صنعتی انقلاب نے تجارت کو اس قدر بڑھایا کہ تمام دنیا کی قومیں ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئیں، ادھر ریل، تار، جہاز ڈاک، ریڈیو نے ایک ملک کو دوسرے ملک سے ملا دیا۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب یورپ کی فضا بین الاقوامیت کے لئے زیادہ سازگار ہے مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس نکلی۔ دولت اور ثروت کے طمع نے ہر بڑی قوم میں یہ خواہش پیدا کر دی کہ تجارت کے میدان میں تمام دوسری قوموں کو گرا کر آگے نکل جائے، اپنے اغراض و مقاصد کے سامنے دوسروں کے مفاد کا ذرا خیال نہ کرے، اور اپنی قومی عظمت اور برتری کو دوسری قوموں سے زبردستی منوائے۔ سامراجی قوموں میں آپس کا مقابلہ شروع ہوا۔ تجارتی سامان کے لئے منڈیوں اور کچے مال کے ذرائع پر قبضہ

کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ تجارت اور ملک گیری کی اس ہوس نے ان قوموں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا۔ اسلحہ بڑھائے گئے، بحری طاقت میں اضافہ کیا گیا نوآبادیاں حاصل کی گئیں۔ اپنے اثر و اقتدار کا سکہ اپنے مدمقابل سے زبردستی منوایا گیا۔ غرض بین الاقوامیت کی جگہ قومیت ہی کا ڈنکا بجنے لگا۔ قوموں کی اس مطلق العنانی میں دنیا کا امن و امان سلامت رہنا ناممکن تھا۔ اس کشاکش کا لازمی نتیجہ جنگ تھا اور جنگ بھی عالمگیر جنگ، چنانچہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم وجود میں آئی۔ تاریخ میں اس سے پہلے کبھی ایسی ہیبت ناک جنگ نہ لڑی گئی تھی۔

بیسویں صدی میں بین الاقوامیت کی اس ناکامی کا سبب یہ نہ تھا کہ ایسے ادارے نہ تھے جو قوموں میں اشتراک عمل پیدا کراتے بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ قوموں میں بین الاقوامی مفاد کے لئے اتحاد اور اشتراک عمل کی خواہش ہی ناپید تھی۔ تخمینہ کیا جاتا ہے کہ اس جنگ میں دو کروڑ انسان کام آئے اور تقریباً دو کھرب پونڈ صرف جنگ کے اخراجات پر صرف ہوا ایسی ہیبت ناک جنگ کے بعد امن و امان کی خواہش کا پیدا ہونا کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ اس سے قبل گزشتہ صدیوں میں ویسٹ فیلیا، اُٹرخت اور ویئنا کے صلحنامے بھی اسی خواہش کا نتیجہ تھے، اور اب ورسائی کے صلحنامہ کا باعث بھی یہی خواہش ہوئی۔ اسی صلحنامے کے بعد انجمن اقوام وجود میں آئی، انجمن اقوام قائم کرنے کا خیال بھی کوئی نیا

خیال نہ تھا۔ انیسویں صدی کے آخر تک یورپ میں تقریباً ایک سو ساٹھ انجمنیں پیدا ہو چکی تھیں۔ جو امن کے قیام کی ترغیب دے رہی تھیں۔ جنگ کے بعد اس خواہش میں اور اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۱۸-۱۹ء میں پیرس کی صلح کانفرنس میں امریکہ کے صدر جمہوریہ ولسن نے صلح کے متعلق جو "چودہ نکات" پیش کئے ان میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی تھی کہ اقوام عالم کی ایک ایسی انجمن قائم کی جائے جس کے دو مخصوص موافقوں کے ذریعے تمام مملکتوں کی سیاسی آزادی اور علاقہ جاتی تفرد کی ضمانت ہو سکے خواہ یہ مملکتیں بڑی ہوں یا چھوٹی"۔

باب ۹

انجمن اقوام

۱۹۱۹ء میں پیرس کی صلح کانفرنس کے وقت انجمن اقوام کے قیام کے جو مقاصد قرار دئے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) صلح کانفرنس کے فیصلوں پر عمل درآمد کرانا۔

(۲) انتظام اور نگرانی کی ان خدمات کو انجام دینا جو انجمن کو تفویض ہوئیں مثلاً اقلیتوں کے حقوق کی نگرانی ڈانزگ کے آزاد شہر کی نگرانی۔ علاقہ جات سار کا انتظام اور تنظام تفویض پر عمل درآمد۔

(۳) جنگ کو روکنا اور قوموں کے آپس کے نزاعات کو پرامن طریقہ پر طے کرانا۔

(۴) دنیا کے عام معاشرتی اور اقتصادی مسائل کے حل کرنے کی کوشش کرنا ۲۸ اپریل ۱۹۱۹ء کو انگلستان، فرانس، اٹلی اور جاپان نے موافقنہ انجمن اقوام پر دستخط کیئے اور یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو انجمن کی زندگی کا پہلا دن شروع ہوا شہر جنیوا انجمن کا صدر مقام قرار دیا گیا۔

انجمن کے قیام کے وقت تو صرف وہی دول انجمن کی رکن تھیں

جو جنگ میں کامیاب ہوئی تھیں۔ لیکن بعد کو انجمن کے اراکین کی تعداد ساٹھ تک پہنچ گئی۔ انجمن کی رکنیت کی شرط یہ قرار پائی کہ "کوئی ایسی مملکت، قلمرو یا نو آبادی جسے پورا سوراج حاصل ہو انجمن کا رکن بن سکتی ہے۔ اگر جمعیت انجمن کی ۲/۳ اکثریت اس کی رکنیت منظور کرے۔ انجمن سے علیحدگی کے لئے اسے دو سال کا نوٹس دینا ضروری ہے۔

اعضائے انجمن اقوام:-

انجمن نے اپنے کام کو پانچ اداروں پر تقسیم کر دیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اسمبلی

(۲) کونسل

(۳) معتمدی (Secretariat)

(۴) بین الاقوامی عدالت (The Permanent Court of International Justice.)

(۵) بین الاقوامی تنظیم (The International Labour Organization.)

اسمبلی | انجمن اقوام کی اسمبلی کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کسی ملک کی قانون ساز مجلس کو حاصل ہوتی ہے۔ انجمن کی ہر رکن مملکت خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی جمعیت کی رکن ہوتی ہے اور اس کو ایک رائے کا حق حاصل ہوتا ہے

اور وہ اپنے تین قائم مقام بھیج سکتی ہے۔ ہندوستان اور دوسری برطانوی خود مختار نوآبادیات جدا جدا مملکتیں قرار دی گئی ہیں۔

اسمبلی کے اجلاس معمولاً ہر سال ستمبر کے پہلے ہفتے میں شروع ہوتے تھے اور ایک مہینہ جاری رہتے تھے یہ وقت ضرورت خاص اجلاس بھی منعقد کیے لئے جاتے ہیں۔ جلسوں کی کارروائی انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ہوتی ہے۔ اسمبلی کا کام زیادہ تر چھ ماتحت کمیٹیوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک قانونی امور کے لئے ہے، دوسری فنی ادارات کے لئے تیسری تخفیف اسلحہ کے لئے۔ چوتھی اندرونی انتظامات کے لئے، پانچویں معاشرتی مسائل کے لئے اور چھٹی سیاسی مسائل کے لئے۔

اسمبلی کا صدر منتخب کیا جاتا ہے اس کی امداد کے لئے بارہ نائب صدر ہوتے ہیں جن میں سے چھ ان کمیٹیوں کے صدر بنائے جاتے ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا۔

اسمبلی کو اپنے اجلاس میں ان تمام معاملات پر بحث کرنے کا حق حاصل ہے جو انجمن کے دائرہ عمل میں ہوں اور جن کا تعلق امن عالم سے ہو، موافقہ انجمن اقوام کی دفعہ ۲۶ کی رو سے اسمبلی موافقہ میں ترمیم بھی کر سکتی ہے اسی طرح دفعہ ۱۹ کی رو سے اس کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ صلحناموں کی دستخط کنندہ مملکتوں کو صلحناموں پر نظر ثانی کرنے کا مشورہ دے اگر یہ صلحنامے ناقابل عمل ہو گئے ہیں۔ مگر صلحناموں کی تبدیلی پر کسی دستخط کنندہ مملکت کو

اسمبلی مجبور نہیں کر سکتی۔ موافقہ کی سب سے اہم دفعہ یہی تھی لیکن آج تک اسمبلی نے اس پر کبھی عمل نہیں کیا۔

مجلس انجمن اقوام کی انتظامیہ جماعت کونسل کہلاتی ہے یہ تین قسم کے اراکین پر مشتمل ہے۔ مستقل غیر مستقل اور عارضی۔ مستقل اراکین وہی دول تھیں جو جنگ عظیم میں کامیاب ہوئی تھیں یعنی برطانیہ، فرانس، اطالیہ اور جاپان، بعد کو سن ۱۹۲۶ء میں جرمنی کو بھی ایک مستقل جگہ مل گئی تھی۔ غیر مستقل اراکین کی تعداد ابتدا میں چار تھی لیکن بعد میں یہ بھی اضافہ ہو کر نو ہو گئی، ان کا اسمبلی انتخاب کرتی ہے، عارضی اراکین وہ ہیں جو وقتی طور پر نشست کرنے کے لئے اس مملکت سے بلائے جاتے ہیں جس کا معاملہ کونسل کے سامنے پیش ہو اور وہ خود کونسل کی رکن نہ ہو۔

کونسل کے سال میں چار اجلاس ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ خاص نشستیں بھی منعقد کی جا سکتی ہیں، کونسل کے صدر اور نائب صدر کا انتخاب ہر سال ہوتا ہے، اہم ترین معاملات کا فیصلہ انجمن کی محض اکثریت پر موقوف نہیں ہے بلکہ ایسے معاملات میں اراکین کا اتفاق رائے ضروری ہے۔

کونسل ان تمام معاملات کو طے کرنے کا حق رکھتی ہے جو انجمن اقوام کے دائرہ عمل میں ہیں موافقہ انجمن اقوام کی دفعہ ۱۵ کی رو سے تمام وہ نزاعات جن کو فریقین ثالثی کے ذریعے طے نہ کرائیں یا جن میں ثالثی نہ ہو سکتی ہو کونسل کے حوالہ کیئے جائیں گے اور جب تک کونسل معاملہ طے نہ کر دے فریقین کو جنگ روکنا پڑے گی۔

کونسل کے ذمہ انتظام اور نگرانی کے بعض امور بھی ہیں مثلاً نظام تفویض اسی طرح وادی سار، اور ڈانزگ کے آزاد شہر کا انتظام بھی انجمن کے سپرد تھا لیکن ۱۹۳۵ء میں سار جرمنی کو واپس مل گیا۔ اور ۱۹۳۹ء میں ڈانزگ جرمنی نے فتح کر لیا۔ موافقہ انجمن کی خلاف ورزی کرنے والی مملکتوں کے خلاف کونسل ہی تہدیدیں عائد کرتی ہے اور وہی اقلیتوں کے تحفظ کی نگرانی کرتی ہے۔ اسمبلی کی تمام سفارشات کونسل ہی کے ذریعہ عمل میں آتی ہیں۔

کونسل کی سالانہ رودادبحث کے لئے اسمبلی کے سامنے پیش ہوتی ہے

معتمدی اس ادارے کو بین الاقوامی سول سروس کہا جا سکتا ہے۔ معتمدی کا صدر معتمد اعلیٰ کہلاتا ہے۔ جس کو اسمبلی کی اکثریت کی منظوری سے کونسل مقرر کرتی ہے اور جو اپنے عہدے کے اعتبار سے اسمبلی اور کونسل دونوں کا معتمد ہوتا ہے۔ یہ معتمدی کے دوسرے عہدہ داروں کو مقرر کرتا ہے جن کی تعداد تقریباً سات سو ہے ان میں ایک نائب معتمد ہوتا ہے اور تین مددگار معتمد۔

معتمدی کے بارہ شعبے ہیں جن کے ذریعے بین الاقوامی مالیات، رسل و رسائل، آمد و رفت، تخفیف اسلحہ، حفظان صحت، نظام تفویض، اقلیتوں اور بین الاقوامی اشتراک عمل کا کام انجام پاتا ہے۔ انجمن کا موازنہ تقریباً ۰۰ ۰۰ ۰ ۰ ۵ ۵ ۵ ۵ ۵ ۳ ۳ ۳ کا ہوتا ہے جس کو معتمد اعلیٰ تیار کرتا ہے اور اسمبلی کو اس پر بحث کرنے اور ترمیم کرنے کا حق حاصل ہے۔

بین الاقوامی عدالت ۱۹۲۰ء میں قائم کی گئی، موافقہ انجمن اقوام کی

رو سے اس کی کونسل کے لئے ضروری قرار دیا گیا تھا کہ وہ ایک مستقل بین الاقوامی عدالت قائم کرے، چنانچہ ایک ایسی عدالت کا دستور تیار کیا گیا جس کو انجمن کی اسمبلی اور کونسل دونوں نے منظور کیا۔ سال ۱۹۲۱ئہ میں انجمن کے ارکین کے اکثریت نے اس کی توثیق کی اور سال ۱۹۲۲ئہ میں عدالت کا رسمی افتتاح ہوا۔ بین الاقوامی عدالت شہر ہیگ میں واقع ہے، اس کے عادلوں کی تعداد پندرہ ہے جن کا انتخاب انجمن اقوام کی اسمبلی اور کونسل کرتی ہے۔ عدالت ان تمام بین الاقوامی تنازعات کو فیصل کرتی ہے جن کو فریقین اپنی خوشی سے عدالت کے روبرو پیش کریں۔ ایسی حالت میں عدالت کی تجاویز پر فریقین کو عمل کرنا لازمی ہے جو معاملات انجمن کی اسمبلی اور کونسل کی طرف سے استصواب رائے کے لئے عدالت میں بھیجے جاتے ہیں۔ عدالت ان پر بھی اپنی رائے پیش کر سکتی ہے۔ قانون عدالت کی دفعہ ۱۱۳ "اختیاری دفعہ" ہے اگر کوئی مملکت اس پر دستخط کر دے تو عدالت کو مندرجہ ذیل امور پر خود بخود اختیار حاصل ہو جاتا ہے:۔

(۱) کسی عہد نامے کی تعبیر (۲) قانون اقوام کی بابتہ کوئی مسئلہ، (۳) ایسے واقعہ کا وجود جس سے بین الاقوامی عہد و پیمان کی خلاف ورزی ہوتی ہو (۴) ایسی خلاف ورزی کی صورت میں ہرجے کا تعین،

عدالت کسی خاص نظام قانون کی پیروی نہیں کرتی بلکہ بین الاقوامی معاہدے جن کے متفقہ قواعد فریقین تسلیم کرلیں، بین الاقوامی رواج، متمدن اقوام کے مسلمہ اصول قانونی، بین الاقوامی نظائر، اور مستند ترین مقننوں کی تحریروں سے متعلقات کے فیصل کرنے میں مدد لی جاتی ہے۔

Intinational labour organization.

بین الاقوامی تنظیم محنت

مزدوروں کی تنظیم کا سوال دنیا میں سب سے پہلے اشتمالی نظریہ لے پیش کیا، چنانچہ ۱۸۶۴ء سے جنگ عظیم تک مزدوروں کو مجتمع کرنے اور اُن کے حقوق کے تحفظ کے لئے کئی انقلابی تنظیمیں وجود میں آئیں لیکن خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ جنگ عظیم کے دوران میں مختلف مملکتوں نے مزدوروں کی وفاداری اور ان کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے ان سے وعدے کئے تھے کہ اُن کی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے گی چنانچہ ورسائی کے صلحنامے کے وقت یہ طے پایا کہ محنت کا ایک بین الاقوامی اخلاقی معیار قائم کیا جائے اور اس قسم کے قواعد بنائے جائیں جن سے مزدوروں اور آجروں کے درمیان کشیدگی کے امکانات نہ رہیں چنانچہ "بین الاقوامی تنظیم محنت" کا ادارہ قائم کیا گیا جس کا صدر مقام جینوا ہے۔

"بین الاقوامی تنظیم محنت" تین اداروں پر مشتمل ہے، پہلا بین الاقوامی محنت کی کانفرنس دوسرا "ادارۂ منتظمہ" اور تیسرا بین الاقوامی محنت کا دفتر۔

بین الاقوامی محنت کانفرنس میں ہر رکن مملکت اپنے چار وفد بھیجتی ہے جن میں دو حکومت کی طرف سے ہوتے ہیں، ایک آجروں کی طرف سے اور ایک مزدوروں کی طرف سے۔ اگرچہ مؤخر الذکر دو نمائندوں کو بھی حکومت ہی مقرر کرتی ہے لیکن ان کے تقرر کے وقت آجروں اور مزدوروں

کی جماعت سے مشورہ کر لیا جاتا ہے۔ کانفرنس ہر سال ایک نشست کرتی ہے۔ قرار دادیں زیادہ تر سفارشوں کی شکل میں ہوتی ہیں اور ان کی منظوری کے لئے کم از کم ⅔ ارکان کی اکثریت ضروری ہے، ان قراردادوں پر اس وقت تک عمل درآمد نہیں ہو سکتا جب تک کہ مختلف مملکتیں ان کی توثیق نہ کر دیں۔

"ادارۂ منتظمہ" چوبیس اراکین پر مشتمل ہے جن میں سے بارہ حکومتوں کے نمائندے ہوتے ہیں، چھ آجروں کے اور چھ مزدوروں کے، یہ تین سال کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں حکومت کے نمائندوں میں آٹھ نمائندے ایسے ہوتے ہیں جو ایسی مملکتوں سے لئے جاتے ہیں جن کی صنعتی اہمیت دوسرے ملکوں سے زیادہ ہے، ان میں ایک نمائندہ ہندوستان کا بھی ہوتا ہے اس کی نشست معمولاً ہر تیسرے مہینہ ہوا کرتی تھی۔

"بین الاقوامی محنت کا دفتر" یہ دفتر بین الاقوامی محنت کی تنظیم کی معتمدیا ہے۔ اس میں ایک ناظم اور تقریباً ساڑھے تین سو ماہرین کا عملہ ہے۔ تمام دفتری کارروائی اسی عملے کے ذریعے ہوتی ہے۔ مثلاً "بین الاقوامی محنت کے متعلق اطلاعات فراہم کرنا اور ان کو شائع کرنا، سالانہ کانفرنس کے لئے پیش نامہ تیار کرنا، مملکتوں کو مجبور کرنا کہ وہ محنت کے عہدناموں پر عمل درآمد کریں اور اس عمل درآمد کی نگرانی کرنا۔

تنظیم محنت کی اصل غرض یہ ہے کہ مزدوری کے متعلق ایسے قوانین بنا دئے جائیں جو تمام دنیا میں یکساں طور پر رائج کئے جا سکیں، چنانچہ اپنے

ایک معاہدہ میں اس نے ہفتہ میں ۴۸ گھنٹے کارکردگی کے مقرر کئے ہیں۔ البتہ
ہندوستان میں ۵۴ گھنٹے مقرر کئے گئے ہیں!۔

اسی طرح مزدور بچوں کی عمر کا تعین کر دیا گیا ہے۔ مرد اور عورت مزدوروں
کی مساوی اُجرت، اور مزدوروں کے اقتصادی مفاد کے لئے قرارداد بھی منظور
کی گئی ہیں۔

۱۷۔ نظامِ تفویض | جنگِ عظیم میں اعلان کیا گیا تھا کہ یہ جنگ حق کے بول بالے
کے لئے لڑی جا رہی ہے جس کا مقصد دنیا سے جنگ کے فتنہ کو ختم کرنا
قومیت کے اصول کو بالا رکھنا اور چھوٹی اور پست قوموں کے حقوق کا تحفظ ہے
جنگِ عظیم سے پہلے کی جنگوں میں یہ دستور رہا تھا کہ غالب فریق مغلوب کے
نوآبادیاتی مقبوضات کو کلیتاً اپنے قبضہ میں کر کے ان کے مالک و مختار
بن جاتے تھے، لیکن جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۱۹ء میں جو صلح کانفرنس ہوئی
اس میں صلحنامہ ورسائی کے ذریعہ اتحادیوں نے یہ طے کیا کہ انھوں نے ایشیا
اور افریقہ میں جرمنی اور ترکی کے جو نوآبادیاتی علاقے فتح کئے ہیں اُن کو آپس
میں تقسیم نہ کریں گے، بلکہ ان میں سے ایک کو کسی نہ کسی ترقی یافتہ قوم
کی نگرانی میں دے دیا جائے گا۔ چنانچہ موافقہ انجمن اقوام کی دفعہ ۲۲
کی رو سے قرار پایا کہ "اُن نوآبادیوں اور علاقوں کو جو جنگِ عظیم کی وجہ سے
اپنی قدیم سلطنتوں کے ماتحت نہیں رہے اور جن کے باشندے فی الحال
اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو سکتے ایسے ترقی یافتہ ممالک کی تولیت
میں رکھا جائے جو اپنے وسائل، تجربے یا جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار

سے اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر لے سکتے ہوں اور جو اس ذمہ داری کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں اور یہ ممالک تولیت کے فرائض کو انجمن اقوام کی طرف سے ادا کریں" یہ نظام "نظام تفویض" کے نام سے موسوم ہے جس کے دو مقصد قرار دئے گئے تھے اول یہ کہ دیسی باشندوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا اور دوئم یہ کہ سامراجی طاقتوں کو اس طرح پابند بنا کر ان کے آپس کے نزاعات کا سدباب کیا جائے گا۔

تفویض تین قسم کی قرار دی گئی (الف) (ب) اور (ج) تفویض (الف) میں وہ علاقے شامل کئے گئے جو زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ مثلاً فلسطین، عراق اور شام، ان کی بابت یہ قرار پایا کہ یہ جلد سے جلد خود مختار کر دئے جائیں گے۔

فلسطین اور عراق برطانیہ کو ملے اور شام فرانس کو۔ تفویض (ب) میں وسطی افریقہ کے علاقے شامل کئے گئے ان میں سے ٹنگانیکا کی حکومت کا برطانیہ کو (رواندا اروندی) کا بلجیم کو، کامے رون اور توگستان کا برطانیہ اور فرانس کو ذمہ دار قرار دیا گیا۔ اور یہ شرط قائم کر دی گئی کہ متولی ملک "ضمیر اور مذہب کی آزادی کی حفاظت کرے گا۔ ایسے افعال شنیعہ مثلاً غلامی، تجارت اسلحہ اور تجارت مسکرات کا انسداد کرے گا۔ کسی قسم کی قلعہ بندی نہ کرے گا، دیسیوں کو فوجی قواعد سکھانے سے احتراز کرے گا ساتھ ہی دوسرے ممالک کی آزاد تجارت میں مخل نہ ہوگا"

تفویض (ج) میں جنوبی مغربی افریقہ اور شمالی بحرالکاہل کے

جزیرے نیوگنی (New Guinea) مغربی سوما (Soma)
اور ناؤرو (Nauru) شامل کئے گئے ان علاقوں میں سے بعض
اپنی آبادی اور رقبہ کے قلیل ہونے کی وجہ سے، بعض تمدن کے
مراکز سے دور ہونے کی باعث اور بعض متولی مملکت سے قریب
ہونے کی وجہ سے متولی مملکتوں کا جزو قرار دئے گئے اور متولی ملک
کو حق دیا گیا کہ وہ اپنے بنائے ہوئے قوانین یہاں نافذ کرے مگر دیسی
آبادیوں کے متعلق انھیں شرائط پر عمل کرے جو تفویض (ب) کے ماتحت
بیان کی گئیں چنانچہ جنوبی مغربی افریقہ اتحاد جنوبی افریقہ کو دیا گیا (نیوگنی)
(آسٹریلیا کو دیا گیا، بحر الکاہل کے شمالی جزیرے جاپان کو دئے گئے
مغربی سوما نیوزی لینڈ کو ملا اور ناؤرو (Nauru) برطانیہ کو ملا، ان
تفویض کے متعلق موافقۂ انجمن اقوام میں یہ اصول طے پایا کہ اہل تفویض
ملک انجمن اقوام کی مجلس کے سامنے ہر سال کی روداد کارکردگی پیش کریں
گے اور مجلس ایک مستقل کمیشن مقرر کرے گی جو ان رودادوں پر غور کرے گا
اور ان کے متعلق اپنی سفارشات مجلس کے سامنے پیش کیا کرے گا۔
اہل تفویض ممالک، مفوضہ ممالک کے امین تھے لیکن انجمن اقوام
کا اثر زائل ہو جانے کی وجہ سے ہر صاحب تفویض ملک نے مفوضہ
ملک کو اپنی ملکیت قرار دے لیا ہے اور سوائے عراق کے اُن میں
سے ہر ملک میں وہاں کے باشندوں کو آزادی کے مطالبات سے باز رکھنے
کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے، اسی طرح تفویض (ب) اور (ج)

کو اہلِ تفویض ملک اپنے مستقل مقبوضات بنائے جاتے ہیں۔

اقلیتوں کا تحفظ

انجمن اقوام نے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی نگرانی اپنے مجلس کی سپرد کی ہے۔ جنگ عظیم کے بعد صلح کے موقعہ پر دول یورپ نے اپنی اقلیتوں کے تحفظ کے بارے میں جو عہد نامے کئے ہیں ان میں اقلیتوں کو خواہ وہ کسی قوم، ملک، زبان، یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں وہی سیاسی اور شہری حقوق دئے گئے ہیں جو اکثریت کو حاصل ہیں اپنی اپنی ریاستوں میں انھیں ملازمت کرنے کا حق حاصل ہے وہ اپنی زبان بغیر کسی روک ٹوک کے اخباروں، کتابوں، گرجاؤں، عدالتوں اور تجارتی کاروبار میں استعمال کر سکتی ہیں۔ اور جن اضلاع میں ان کی آبادی کافی ہے وہاں ان کے بچوں کو ابتدائی تعلیم بھی انھیں کی مادری زبان میں دی جاتی ہے۔

ان عہدناموں کی خلاف ورزی کی اطلاع درخواست کی شکل میں انجمن اقوام کی مجلس کو دی جاتی ہے۔ یہ درخواست متعلقہ حکومت کے پاس بھیج دی جاتی ہے اور پھر اصل درخواست اور اس پر حکومت کا جواب مجلس کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ مجلس اس قسم کے معاملات کو خود طے نہیں کرتی بلکہ اس غرض کے لئے ایک کمیشن مقرر کرتی ہے جو اس کا تصفیہ کرتا ہے کہ معاملہ اس قابل ہے کہ مجلس کے سامنے پیش کیا جائے

یا نہیں۔ معاملے کے سامنے آجانے کے بعد مجلس کا فرض ہے کہ وہ اقلیت اور متعلقہ حکومت کے درمیان رفع شکوک کرا دے اور ان دونوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرے۔ لیکن ہوا یہ کہ باوجودیکہ مجلس کے سامنے متعدد درخواستیں پیش ہوئیں اس کے اراکین نے متعلقہ حکومت سے دشمنی مول لینا پسند نہ کیا اور عام طور پر وہ درخواستیں بے اثر رہیں۔

تہدیدیں Sanctions

انجمن اقوام نے امن عالم کو اپنے قیام کا مقصد قرار دیا تھا اور اپنے موافقہ کے ذریعے اقوام عالم سے وعدہ لیا تھا کہ وہ صلح اور امن کے ساتھ رہیں گی۔ تنازعات کے پرامن تصفیہ کے قواعد موافقہ انجمن کی دفعات ۱۲ و ۱۳ و ۱۴ اور ۱۵ پر مشتمل ہیں، جن کا مقصد یہ ہے کہ اگر انجمن کے دو اراکان کے درمیان نزاع رونما ہوگا تو وہ اپنے اس نزاع کو ثالثوں یا بین الاقوامی عادلوں کے سپرد کریں گی اور انجمن اقوام کی مجلس کے اراکین اتفاق رائے سے جو سمجھوتہ تجویز کریں گے اس پر عمل کریں گی۔ اراکین انجمن اس کا وعدہ کرتے ہیں کہ جو فریق اس تجویز کے مطابق عمل کرے گا اس کے خلاف جنگ نہ کریں گے لیکن اس تجویز کی خلاف ورزی کرنے والا فریق انجمن کے جملہ اراکین کا مخالف سمجھا جائے گا اور ایسی حالت میں انجمن کے جملہ باقی ماندہ اراکین اس کو مجبور کریں گے کہ وہ موافقہ انجمن کی خلاف ورزی نہ کرے، وہ اس خطاوار مملکت سے اپنے تمام تجارتی یا مالی تعلقات منقطع کر دیں گے

اور اپنے شہریوں اور خطاوار مملکت کے شہریوں کے درمیان ہر قسم کے راہ و رسم کو ممنوع قرار دیں گے" نیز مجلس ہر متعلقہ حکومت سے سفارش کرے گی کہ خطاوار مملکت کو سزا دینے کے لئے بحری یا ہوائی فوج مہیا کرے، ساتھ ہی ساتھ موافقہ میں یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ اراکین انجمن اس مملکت سے بھی تعلقات منقطع کر لیں گے جو انجمن کی رکن نہیں ہے اور جس نے انجمن کے کسی رکن کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے، انجمن کی یہ تعزیری کارروائی "تہدیدوں" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے موافقہ انجمن میں جن تہدیدوں کا اعلان کیا گیا ہے وہ تین قسم کی ہیں (۱) اقتصادی (۲) فوجی (۳) سیاسی

اقتصادی تہدیدیں وہ ہیں جو بعض مملکتوں کی طرف سے جنگ حبشہ کے زمانے میں تیل کے علاوہ بعض تجارتی اشیاء کی درآمد پر عائد کی گئیں تھیں۔ فوجی تہدیدوں سے یہ مراد ہے کہ انجمن اقوام کی مجلس کی سفارش پر انجمن کے اراکین ملک مسلح فوجیں خطاوار مملکت کی سرکوبی کے لئے بھیجیں گے لیکن اب تک یہ تہدیدیں کسی موقعہ پر عائد نہیں کی گئیں۔ اور سیاسی تہدیدوں سے یہ مراد ہے کہ موافقۂ انجمن کی خلاف ورزی کرنے والی مملکت کو انجمن کے اراکین کی اتفاقِ رائے سے انجمن سے نکال دیا جائے گا، انجمن اپنے کسی رکن کو ان تہدیدوں کے عائد کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی اور اسی وجہ سے تہدیدوں کا اصول کارگر نہ ہوا۔

انجمن اقوام اور امن عالم

اپنی زندگی کے ابتدائی دس سال تک انجمن اقوام کی کامیابی کا دور رہا۔ چنانچہ اس دور میں اس نے متعدد جھگڑے طے کرائے مثلاً ۱۹۲۲ء میں روس اور سوئیڈن کے درمیان جزائر آلینڈ کے معاملہ میں تزاع ہوا۔ سوئیڈن ان جزائر کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتا تھا، لیکن انجمن اقوام کی مداخلت نے اس کو باز رکھا اور سوئیڈن کو انجمن کا تصفیہ منظور کرنا پڑا۔ اسی طرح ۱۹۲۵ء میں یونان اور بلغاریہ کے درمیان جنگ چھڑ جانے کا خطرہ پیدا ہوا۔ ایک یونانی سپاہی نے بلغاریہ کی سرحد پر بلغاری سنتری پر گولی چلادی جس پر یونانیوں اور بلغاریوں کے درمیان گولی چلنے لگی۔ بلغاریہ نے انجمن اقوام کو اطلاع دی۔ انجمن نے مداخلت کی اور یونان کو انجمن کا تصفیہ ماننا پڑا اور تاوان جنگ ادا کرنا پڑا۔ ۱۹۳۲ء میں کولمبیا اور پیرو کی مملکتوں کے مابین جھگڑا ہوا تو اس میں بھی انجمن فریقین کے درمیان مفاہمت کرا سکی۔ انجمن کی اسی زمانے کی کامیابی کی مثال ۱۹۲۵ء کے وہ عہد نامے بھی ہیں جنھیں لوکارنو کے عہد ناموں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

یہ عہد نامے برطانیہ، فرانس، جرمنی، بلجیم، اطالیہ، پولستان اور چیکوسلوواکیہ کے مابین ہوئے اور ان میں طے پایا کہ دستخط کنندہ مملکتیں ان سرحدوں کی ضمانت کریں گی جو وارسائی کے صلحنامے نے مختلف ممالک کی مقرر کی ہیں، اور فریقین اپنے ایسے نزاعات کو جن سے آپس میں جنگ چھڑنے

کا اندیشہ ہو یا تو ثالثی اور پنچایت کے ذریعے طے کرائیں گے۔ یا تصفیہ کے لئے انجمن اقوام کی کونسل کے سپرد کر دیں گے۔ ان عہدناموں کے علاوہ یکم جنوری ۱۹۲۵ء تک انجمن اقوام کے دفتر میں تقریباً ۲۳۸ ایسے صلحناموں کی رجسٹری ہوئی جن میں فریقین نے باہم معاہدہ کیا تھا کہ وہ اپنے نزاعات کو پرامن طریقوں پر طے کریں گے۔ ۱۹۲۸ء میں انجمن کی اسمبلی نے ایک قانون پاس کیا جس کو "جنرل ایکٹ" کہا جاتا ہے۔ اس قانون پر دستخط کنندہ مملکتوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے تمام نزاعی معاملات کو مفاہمت کرانے والے ماموریں کے سپرد کر دیں گی۔ اگر اس طرح مفاہمت نہ ہو سکی تو بین الاقوامی عدالت میں پیش کریں گی۔ اسی سال ۲۷ اگست کو پیرس کا وہ معاہدہ ہوا جس کو Kellog Bicand Pact بھی کہا جاتا ہے۔ اس کو دنیا کی تمام اقوام نے منظور کیا۔ اور قطعی لفظوں میں یہ وعدہ کیا کہ وہ اپنے ہر قسم کے نزاعات کو پرامن طریقوں کے سوا کسی دوسرے طریقے سے طے ہی نہ کریں گی۔ لیکن یہ تمام معاہدے بے سود ثابت ہوئے کیونکہ ان میں کوئی ایسی شرط نہ تھی جس کے ذریعے خلاف ورزی کرنے والی مملکتوں سے جبراً ان کی پابندی کرائی جا سکتی۔ جب پابندی کرنے کا وقت آیا تو ہر مملکت نے عملاً معاہدے کے خلاف ہی کیا چنانچہ یہیں سے انجمن کی ناکامی کا دور شروع ہوا ہے۔

انجمن اقوام کی ناکامی کا دور

وہ تمام نزاعات جن میں انجمن کو ابتدا میں کامیابی ہوئی یا تو چھوٹی مملکتوں

سکے امین تھے یا ایسے تھے جن سے کسی بڑی جنگ کا اندیشہ نہ تھا، لیکن
۱۹۳۰ء کے بعد جب بڑی مملکتوں کے نزاعات انجمن کے سامنے آئے
تو ان کے تصفیئے کے لئے انجمن بالکل بے دست و پا ثابت شروع ہوئی
وجہ یہ تھی کہ ان مملکتوں کا اثر خود انجمن میں بہت زیادہ تھا۔ اور وہ یہاں اپنی
بات منوا سکتی تھی۔ جنگ کے خطرے کو مٹانے کے لئے فروری ۱۹۳۲ء
میں انجمن نے تخفیف اسلحہ کے لئے جو کانفرنس جینوا میں منعقد کی اس میں
۵۰ مملکتوں نے اپنے نمایندے بھیجے لیکن فیصلہ کچھ بھی نہ ہوسکا۔ بڑی
مملکتوں میں سے کوئی بھی اسلحہ کم کرنے کو تیار نہ ہوئی۔ وہ بدستور فوجوں،
اور بحری اور ہوائی بیڑوں کو بڑھاتی رہیں۔ اور قومی خود غرضی پر بین الاقوامی مفاد
کی بھینٹ چڑھاتی رہیں۔ اس کی مثال تو اس سے پہلے ہی ۱۹۳۱ء میں
دنیا کے سامنے آ گئی تھی جبکہ جاپان نے اپنے ذاتی اغراض اور تجارتی
مفاد کی وجہ سے چین کے منچوری صوبوں پر قبضہ کیا تھا اور انجمن اقوام بیٹھی
دیکھتی رہی تھی۔

چین اور جاپان دونوں انجمن کے رکن تھے۔ چین نے انجمن کو لکھا۔
انجمن نے دونوں فریقین کو جنگ روکنے کے لئے تار بھیجے لیکن جاپان نے
لڑائی بند نہ کی انجمن کی مجلس نے دسمبر ۱۹۳۱ء میں لارڈ لٹن کی صدارت میں
ایک کمیشن واقعات کی تفتیش کے لئے مقرر کیا۔ یہ کمیشن اکتوبر ۱۹۳۲ء تک
اپنی روداد پیش نہ کر سکا۔ اس اثنا میں جاپان نے منچوریا پر قبضہ کر لیا چین
نے انجمن کی اسمبلی کو لکھا اور انجمن نے انیس نمائندوں کی ایک کمیٹی مقرر کی

کردہ سفارشات پیش کرے۔ اس اثناء میں لٹن کمیشن کی رپورٹ بھی شائع ہو چکی تھی۔ جس میں جاپان کے خلاف فیصلہ صادر کیا گیا تھا۔ اسمبلی کی اس مقرر کردہ کمیٹی نے لٹن کمیشن کی سفارشات کو اسمبلی کے سامنے پیش کیا اور فروری ۱۹۳۳ء میں کثرت رائے سے اسمبلی نے اس کو منظور بھی کیا لیکن جاپان نے بجائے اس کے کہ تصفیے کو مانے انجمن سے علیحدگی کا نوٹس دیدیا۔ جاپان کی اس تمام روش پر انجمن کی طرف سے اس کے خلاف کوئی عملی کارروائی نہ کی گئی۔ یہاں تک کہ جولائی ۱۹۳۷ء میں جاپان نے چین کے ساتھ دوبارہ جنگ شروع کر دی۔ چین نے انجمن سے پھر مدد طلب کی لیکن اس دفعہ بھی انجمن نے زبانی جمع خرچ سے کام لیا۔ جب چین کا اصرار حد سے بڑھا تو انجمن نے فیصلہ کیا کہ جاپان کے خلاف جو مملکت چاہے اقتصادی تہدیدیں عائد کر دے، یہ گویا اپنی شکست کا آپ اعتراف تھا۔ کون مملکت اس کو پسند کرے گی کہ جاپان سے تنہا اپنے تجارتی تعلقات منقطع کرلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی ایک مملکت نے بھی تہدیدیں عائد نہ کیں اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ان ممالک کے نزدیک ذاتی اغراض و مفاد کے مقابل بین الاقوامی اصول کوئی وقعت اور اہمیت نہیں رکھتا۔ انجمن اقوام کی ناکامی کی اس سے زیادہ بڑی مثال اطالیہ اور حبشہ کی جنگ ہے۔ اطالیہ نے اپنی بڑھتی ہوئی آبادی اور اپنی مصنوعات کے لئے حبشہ پر نظر ڈالی اور اس کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ اطالوی افواج اور ہوائی قوت کا مقابلہ حبشہ کے بس کی بات نہ تھی۔ انجمن اقوام کے رکن ہونے کی حیثیت سے اس نے انجمن سے استدعا کی کہ اطالیہ کے خلاف

تہدیدیں عائد کرے ۔ جاپان اور جرمنی تو انجمن سے علحدہ ہو ہی چکے تھے۔ البتہ آسٹریا اور ہنگری نے جو انجمن کے رکن تھے اطالیہ کی مخالفت کرنے سے انکار کر دیا ۔ البتہ انجمن کی چھوٹی رکن مملکتوں کے اصرار پر برطانیہ اور فرانس کو چار و نا چار تہدیدیں عائد کرنا پڑیں ۔ یہ تہدیدیں بھی صرف روپے اور اسلحہ کی درآمد اور برآمد پر تھیں ۔ جنگ کے دو اہم لوازمات تیل اور پٹرول پر کوئی پابندی عائد نہ کی گئی کیونکہ مسولینی نے اعلان کر دیا تھا کہ تیل پر تہدیدیں عائد کرنے والی مملکت کے ساتھ وہ جنگ کا اعلان کر دے گا ۔ چنانچہ اطالیہ نے ان تہدیدوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور جنگ میں مصروف رہا جبشہ کے شہنشاہ نجاشی نے خود انجمن کی اسمبلی کے روبرو حاضر ہو کر امداد کی التجا کی مگر کوئی مدد نہ ملی ۔ یہاں تک کہ مئی ۱۹۳۶ء میں مسولینی نے جبشہ کو فتح کر لیا ۔ جبشہ کی فتح کے بعد انجمن کی اجازت سے رکن مملکتوں نے تہدیدیں واپس لے لیں!

ان پیہم واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑی مملکتوں کی نظر میں انجمن اقوام کی اگر کچھ وقعت تھی بھی تو وہ ختم ہو گئی اور انھوں نے کھلم کھلا اس کی مخالفت اور اس سے بے پروائی شروع کر دی ۔ چنانچہ پہل جرمنی نے کی ۔ ۱۶ / جنوری ۱۹۳۵ء کو ہٹلر نے ورسائی کے عہد نامے کی پابندی کرنے سے علی الاعلان انکار کر دیا اور انجمن اقوام سے جرمنی کو علحدہ کر لیا ۔ اور اپنی علحدگی کا سبب یہ بتایا کہ چونکہ تخفیف اسلحہ کے سلسلہ میں اتحادیوں نے عہد نامے کی پابندی نہیں کی اس وجہ سے جرمنی بھی عہد نامے کی عائد کی ہوئی اس پابندی پر عمل کرنے کو تیار نہیں کہ وہ اپنی افواج کو ایک لاکھ سے زیادہ نہ بڑھائے اور

ملک میں فوجی تعلیم لازمی قرار نہ دے۔

اطالیہ نے بھی انجمن سے علیحدگی اختیار کر کے جرمنی کے ساتھ سیاسی اتحاد قائم کیا اور جاپان کو بھی اس اتحاد میں شامل کر لیا گیا۔ ان ملکتوں کو شاید اس بات کا یقین تھا کہ ان کی دست درازیوں پر دول عظمیٰ اس وقت تک تعرض نہ کریں گی جب تک کہ ان کے اغراض محفوظ ہیں چنانچہ انھوں نے اپنی حکومتوں کا سب سے اہم مقصد یہ قرار دیا کہ اپنے ملکوں کو طاقتور بنایا جائے۔ اور اپنی قومی ترقی کے مقابلے میں کسی دوسرے ملک کے مفاد یا کسی دوسرے عہدنامے کی پرواہ نہ کی جائے' مارچ سنہ ۱۹۳۶ء میں ہٹلر نے یہ کہہ کر کہ چونکہ آسٹریا کے باشندے جرمن ہیں اس لئے جرمنی کو حق ہے کہ آسٹریا کو اپنے ساتھ شامل کرے آسٹریا پر قبضہ کر لیا۔

ستمبر سنہ ۱۹۳۸ء میں چیکوسلوواکیا کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ ہٹلر نے اس ملک کے سوڈیٹن علاقے پر جرمنی کے قبضے کا مطالبہ کیا کیونکہ اس میں سوڈیٹن جرمن آباد تھے۔ اور وہ جرمنی کے ساتھ ضم ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء کی میونک کانفرنس میں جرمنی کے اس حق کو تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن جرمنی کی نظر تو چیکوسلوواکیا کے سارے ملک پر تھی۔ اس نے اس پر بس نہ کیا بلکہ مارچ سنہ ۱۹۳۹ء میں چیکوسلوواکیا کے دوسرے حصوں بوہیمیہ اور موریویا پر بھی قبضہ کر لیا۔ چند ہی روز بعد لیتھونیہ سے میمل کا علاقہ بھی لے لیا اور کسی نے کچھ نہ کیا۔ مسولینی ہٹلر

سے پیچھے بھلا کیوں رہتا اس نے بھی ایک ہی مہینہ بعد البانیہ کو دبا لیا۔ اس بے روک ٹوک کامیابی نے آمروں کے حوصلے اور بھی بڑھائے اور اب ہٹلر نے پولینڈ سے ڈانزگ اور کوری ڈور کے علاقے کا مطالبہ کیا۔ پولینڈ نے ہٹلر کے حق اور اس کے مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہٹلر کی فوجوں نے پولینڈ کی سرحد پر بمباری شروع کر دی۔ ہٹلر کے اس حملہ نے فرانس اور برطانیہ کو مجبور کر دیا کہ وہ پولینڈ کا ساتھ دیں چنانچہ اس اختلاف نے موجودہ جنگ کا آغاز کرایا اور باہمی مفاہمت اور تصفیہ سے معاملات کو حل کرنے کی امید دل کا خاتمہ ہوا اور آخری فیصلہ کے لئے پھر قوت ہی کو حکم بنانا پڑا۔ لیکن اگر انسان نے اپنی غلطیوں سے سبق لینے کی صلاحیت بالکل ضائع نہیں کر دی ہے تو کیا عجب ہے کہ اس ہیبت ناک جنگ کے خاتمہ پر ضمیر انسانیت قیام امن کی جو کوشش کرے وہ زیادہ پائدار ثابت ہو۔ انسانی ترقی پر یقین رکھنے والوں کی یہی تمنا ہے اور یہی ان کی امید۔

انجمن اقوام کی معاشرتی کارگزاریاں

ہم نے دیکھا کہ انجمن اپنی سیاسی روش سے اپنے اس دعوے کو صحیح ثابت نہ کر سکی کہ دنیا میں امن پھیلانے کا وہی ایک آلہ ہے۔ البتہ معاشرتی اصلاح کے سلسلہ میں انجمن نے جو کوششیں کیں وہ بڑی حد تک کامیاب رہیں اور قابل ذکر ہیں۔ انجمن کی متعدی کا ایک شعبہ "تنظیم صحت" ہے جو

عامتہ الناس کی صحت کو ترقی دینے کے لئے تدابیر سوچتا اور اختیار کرتا ہے، اس سلسلہ میں انجمن کے پاس ماہرین فن ڈاکٹروں کی ایک کمیٹی ہے اور ایک "مجلس مشاورت" جس میں حکومتیں اپنے نمائندے بھیجتی ہیں۔ انجمن نے سنگاپور میں اپنا ایک محکمہ Epidemi Cological Intelligence Service قائم کیا جو متعدی بیماریوں کے متعلق برابر تحقیقات کرتا رہتا ہے اور جنیوا کے صدر دفتر کو اطلاع دیتا رہتا ہے وہاں سے یہ اطلاعات ہفتہ وار اور کبھی کبھی سہ ماہی رسالوں کی شکل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حقیقتاً اس سلسلہ میں انجمن کی کوششیں بے لوث ہیں اور عالم انسانیت میں اتحاد اور ارتباط پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ اسی طرح انجمن کی ایک دوسری کمیٹی کا مقصد بین الاقوامی علمی اور ذہنی اشتراک عمل قائم کرنا ہے۔ یہ کمیٹی دنیا کے مشہور اہل علم پر مشتمل ہے جو اپنی تصانیف کے ذریعے دنیا میں امن کے جذبہ کو ترقی دینے کی کوشش کرتے ہیں، اور دنیا کی مملکتوں کو اپنے نظام تعلیم وغیرہ کے درست کرنے میں مشورے دیتے ہیں، کمیٹی کی پیش کی ہوئی بہت سی ایسی تجاویز جو بچوں کی تعلیم سے متعلق ہیں انجمن اقوام کے اغراض و مقاصد میں شامل کر لی گئی ہیں۔ ان میں مملکتوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ اپنی درسی کتب سے ایسی باتیں نکال دیں جو بین الاقوامی منافرت کو ترقی دینے والی ہیں اور ایسی باتیں شامل کریں جو بین الاقوامی مطمح نظر پیدا کر سکیں۔ کمیٹی نوجوانوں کو دوسرے ملکوں کی سیر و سیاحت کی ترغیب بھی دلاتی رہتی ہے تاکہ ان کے اندر

مختلف تہذیبوں کے سمجھنے اور ان کی قدر کرنے کا جذبہ پیدا ہو، کمیٹی یہ کوشش بھی کرتی رہتی ہے کہ دنیا میں علوم وفنون کے اداروں میں اتحادِ عمل پیدا کرائے، اس قسم کے بین الاقوامی علمی اجلاس بھی منعقد کرتی ہے جن میں دنیا کے فلسفی اور سائنس داں جمع ہوں۔

انجمن سے متعلق اور چھ کمیٹیاں بھی ہیں جو بین الاقوامی معاشرتی اصلاح کے لئے ضابطے اور قوانین بناتی رہتی ہیں۔ اس سلسلہ میں انجمن کی چند کوششیں قابل ذکر ہیں۔ مثلاً افریقہ اور بعض دوسرے مقامات میں غلامی کا انسداد۔ عورتوں اور بچوں کی تجارت پر پابندیاں۔ مخرب اخلاق تصانیف پر بندشیں، کم عمر لڑکے لڑکیوں کی شادی کے متعلق قوانین، اندھے بچوں کی تعلیم کا انتظام، مسکرات کی تجارت کی روک تھام۔

انجمن اقوام کی تاریخ پر اگر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انجمن میں کمزوریاں ضرور ہیں۔ اس کو بہت سی ناکامیوں سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اپنی زندگی کے اس تھوڑے سے عرصے میں انجمن دنیا کی مملکتوں میں بین الاقوامی اتحاد اور اشتراک عمل کی ضرورت کا احساس ضرور پیدا کراسکی، جو بین الاقوامی امن کے قیام کے لئے لازمی چیز ہے۔ رہا امن کا قیام وہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ مملکتوں کا مطمح نظر یہ نہ ہو کہ آپس کے نزاعات کو جنگ کے بجائے پُرامن طریقوں سے طے کریں اور ہر قومی سے قومی مملکت کا نصب العین یہ نہ ہو کہ اُسے اپنی قومی اور ملکی سیاست کے مقابلہ میں قوموں کی اس بڑی برادری کے مفاد پر نظر رکھنا ہے جس کی وہ خود ایک رکن ہے۔

باب ۱

بین الاقوامیت کا مستقبل

بین الاقوامیت کے ماضی اور حال کو دیکھتے ہوئے تو مستقبل کچھ زیادہ امید افزا نظر نہیں آتا۔ البتہ یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ موجودہ جنگ کے اختتام پر بین الاقوامی مسئلہ کی نوعیت وہی ہوگی جو ۱۹۱۹ء کی پیرس کی صلح کے وقت تھی، یورپ کو دو راستوں میں سے ایک اختیار کرنا ہوگا۔ یا تو مکمل اقتدار اعلیٰ، توازن طاقت اور قومی غلبہ و استبداد کے پرانے اصولوں پر بدستور قائم رہ کر قوموں میں باہمی جنگ و جدال کے جذبہ کو برقرار رکھے، یا ایسی تدابیر سوچے جن سے وہ امن قائم ہو سکے جس کی بنیاد انصاف، حق اور انسانیت پر ہو۔ اگر غالب فریق مغلوب فریق کو اس طرح دبانا چاہے کہ وہ پھر ابھر نہ سکے تو ایسی صلح کو دوام حاصل ہونا ناممکن ہے، بیس نہیں چالیس سال بعد پھر متمدن دنیا کو انہیں حالات سے دوچار ہونا پڑے گا کیونکہ زخم خوردہ فریق کوشش کرے گا کہ جس طرح ہو ایسی صلح کی عائد کی ہوئی پابندیوں سے نجات حاصل کرنے اور اس طرح ردعمل کے خوفناک نتائج بار بار دنیا کے سامنے آتے رہیں گے۔

تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسی مثال ملے کہ اس قسم کا امن دنیا میں ہمیشہ
باقی رہ سکا ہو، البتہ امن کے قیام کی عملی صورت یہ ہے کہ یورپ یا تو اپنا
وفاق قائم کرے یا انجمن اقوام کی تنظیم اس طریقے پر کرے کہ وہ عملی طور پر
موثر ثابت ہو سکے۔ دونوں حالتوں میں یورپ کی مملکتوں کو اپنے قومی اقتدار
اعلیٰ میں سے کچھ حصہ قربان کر کے بین الاقوامی رواداری کے اصول کی طرف
آنا ہوگا اور اس کلیہ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ جس طرح ہیئت اجتماعی میں فرد باوجود
اپنی آزادی اور اپنے حقوق کے پابندیوں سے آزاد نہیں ہے اسی طرح
قومیں بھی آزاد نہیں ہیں۔ وہ بھی بین الاقوامی ہیئت میں باہم گروابستہ ہیں
اور اس وابستگی ہی کی وجہ سے بین الاقوامی پابندیاں ان پر عائد ہوتی ہیں
ایک طرف تو مملکتیں اپنی پابندیاں محسوس کریں اور دوسری طرف بین الاقوامی
تنظیم، ان کی زندگی کی آزادانہ نشوونما کو اپنا نصب العین قرار دے جدید
بین الاقوامی تنظیم کو یہ بات بھی مدنظر رکھنا ہوگی کہ وہ سامراجی قوتیں جو دنیا
کے وسیع خطوں پر حکمرانی کر رہی ہیں League کے اجزا میں سے کسی
ایک جزو کو بھی اس کے حقوق سے محروم نہ کریں۔ اگر کمزور مملکتوں کے
ساتھ طاقتور مملکتیں یا محکوم قوموں کے ساتھ حاکم قومیں ناانصافی کا برتاؤ
کریں تو زیردستوں کے حقوق دلانے کے لئے بین الاقوامی تنظیم کے
پاس ایک عدالت ہو جو منظم قوت کی مدد سے اپنا فیصلہ جبراً منوا سکے
اگر اس قسم کی کوئی تنظیم وجود میں آ گئی تو ضرور امید ہے کہ ایک مدت کے
لئے دنیا کو امن میسر آ سکے گا،

لیکن سب کچھ جب ہی ممکن ہے کہ جنگ کی ہولناکیوں سے متاثر
ہو کر اور بے گناہ عورتوں اور بچوں کی ہلاکت کے دلفگار مناظر پر شرما کر
ضمیر انسانی میں ایسا تغیر پیدا ہو کہ وہ اس سفاکی کی تکرار کو دل سے روکنا
چاہے۔ جب تک کہ احساس حقیقی نہ ہوگا اور محض قومی خود غرضیوں کے
لئے آڑ کا کام دیگا اس وقت تک محض اداروں کے قیام سے کچھ نتیجہ
نہیں نکل سکتا۔ ادارے تو بس خول ہوتے ہیں، اگر مغز زندہ نہ ہو تو پھر
زیادہ دن نہیں چل سکتا۔

کتب حوالہ

Essays on Nationalism	C. J. H. Hayes
Nationalism & Internationalism	Ramsay Muir
Nationality: *Its* nature and Problems	Bernard Joseph
Nationalism: A Report of the Board of International Affairs	London 1939
National States and National Minorities	C. A. Macartney
Nationalism and the future of civilization	Herold Laski
Nationalism in the East	Hans Kohn
International Organization	York Hedges
The League of Nations and the Rule of Law	Sir Alfred Zimmern
Federation and World Order	Duncan & Elizabeth Wilson (1940)